اللہ تعالیٰ کے رحم اور فضل کے ساتھ

ماہنامہ

قندیل ادب

اگست 2016ء

مدیر : رانا عبدالرزاق خان

07886304637 & 02089449385

rana_razzaq@hotmail.com

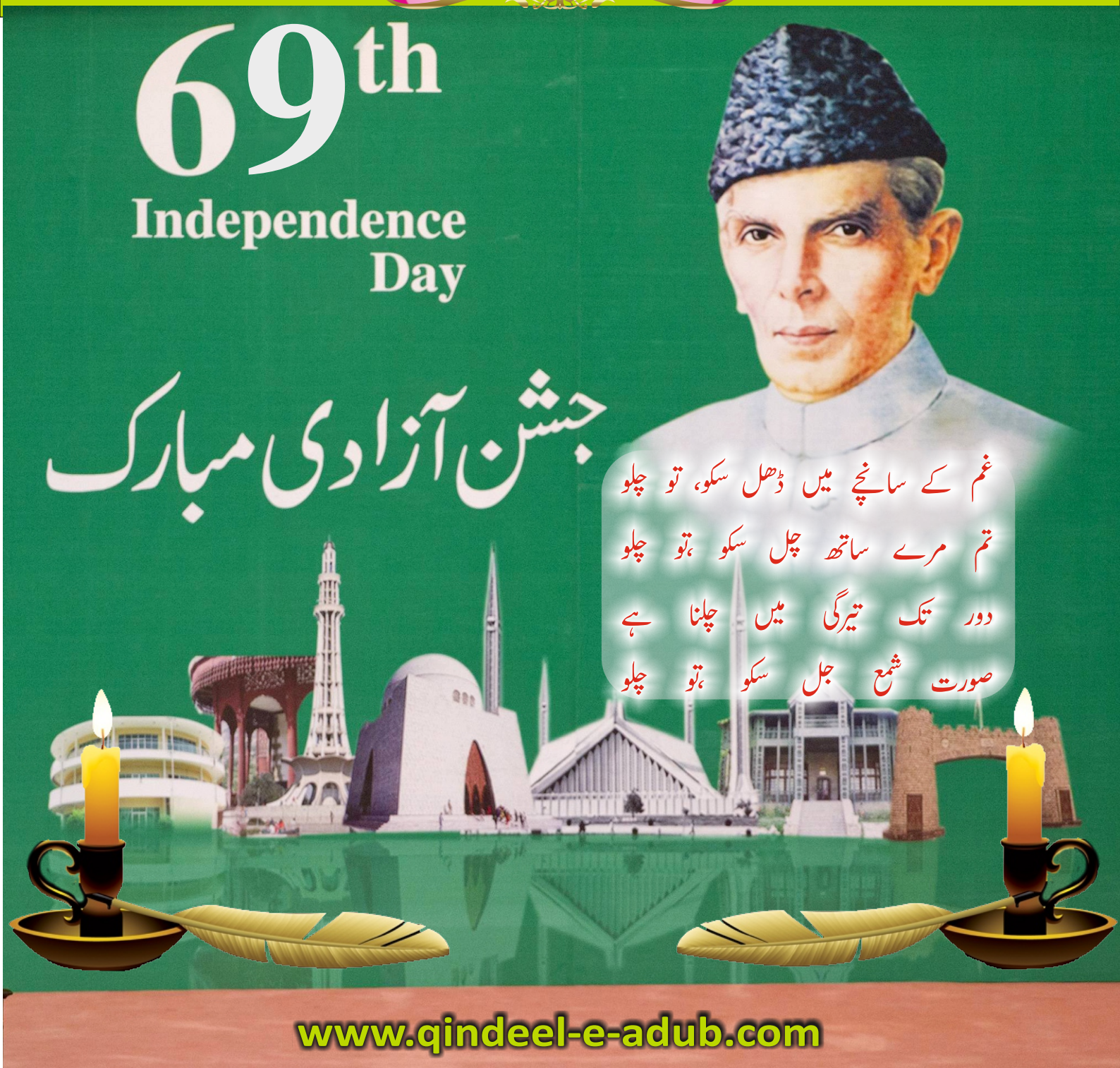

www.qindeel-e-adub.com

ماہنامہ قندیل اَدب اِنٹرنیشنل لندن

مدیر:
رانا عبدالرزاق خان

شمارہ نمبر:44 اگست 2016ء

فہرست

نامے جو میرے نام آتے ہیں	ادارہ	2
غزلیات: فیض احمد فیض۔احمد فراز، احمد ندیم قاسمی، حبیب جالب، منیر نیازی، مبارک احمد عابد، جمیل الرحمن، منور احمد کنڈے، فاخرہ بتول، ظاہر لہڑی، مظفر احمد مظفر، عامر حسنی، آدم چغتائی، سوہن راہی، احمد منیب، انجم شہزاد، عبدالمجید ظفر، ڈاکٹر سید صفیر صفی، حمیدہ معین رضوی، قیصر شیراز، عاصی صحرائی، ہادی مونس، ابنِ ریاض، ارشاد نیازی، ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ، شائق نصیر پوری، طارق احمد مرزا، چوہدری محمد علی مضطر عارفی، غلام محمد قاصر، مبارک احمد عابد، علی سردار جعفری، پروین شاکر، طفیل عامر۔سہیل احمد لون، عبدالجلیل عبا		10-3
امن کا سفیر سرافتخار احمد ایاز	محی الدین عباسی	10
چودہ اگست یومِ محاسبہ	رانا عبدالرزاق خاں	11
مسیحائے انسانیت کی مفارقت	ابن لطیف کاٹھگڑی	12
محمد علی کلے	قیصر محمود	13
مجھے خوبصورت خواتین پسند ہیں	محی الدین عباسی لندن	14
تیسری عالمگیر جنگ۔کیا خطرہ روز بروز بڑھ رہا ہے	زبیر خلیل خان (کروشیا)	15
اُردشیر ایران کے مشہور چار بادشاہوں کا لقب	ابن لطیف (Arataxerxes)	16
دنیا کا پہلا فلسفی۔تھیلیز آف ملیٹس	عاصی صحرائی	17
رومان کی شاعرہ پروین شاکر	اے آر راجپوت	20
اچھی شاعری کی کچھ معروضات	صادق باجوہ میری لینڈ	22
سراپا محبت شاعر غلام محمد قاصر	بلال افتخار رانا	23
مسلمان تاجروں کی سدا بہار یادگار	ڈاکٹر طارق احمد مرزا۔آسٹریلیا	23
کشف المحجوب: یہ ترجمہ ہے یا دخل در معقولات	ڈاکٹر طارق احمد مرزا۔آسٹریلیا	24
محمد علی جناح اور ویمبلڈن کی مسجد	انعام الحق	25
روشنی دینے والی مخلوق	زکریا ورک (ٹورنٹو کینیڈا)	26
عاشق انسانیت	اے حق۔لندن	27
انتظار	امجد مرزا امجد	28
اُردو اَدب کی موزوں شخصیات جسے پاکستان نے قبول نہ کیا	رانا عبدالرزاق خان لندن	29
پیغامبرِ سخن۔ڈاکٹر عبدالغفار عزم پی ایچ ڈی مرحوم	مظفر احمد مظفر	30
مشاعرہ قندیل شعر و سخن باالہم	(رپورٹ رانا عبدالرزاق خاں)	32
خط		33

مجلس ادارت

زکریا ورک، امجد مرزا امجد، ایم اے حق بھارت، خواجہ عبدالمومن ناروے، آصف علی پرویز

نگرانِ اعلیٰ	:	خان بشیر احمد خان رفیق لندن
مدیر	:	رانا عبدالرزاق خاں
معاون مدیر	:	سید حسن خان
مدیر خصوصی	:	سہیل لون
ڈیزائنر	:	کرشن احمد
مینجنگ ڈائریکٹر	:	عاصی صحرائی
فوٹو گرافی	:	قاضی عبدالرشید، فضل عمر ڈوگر
آڈیو وڈیو	:	محمد اشرف خاکی

اراکین مشاورتی بورڈ

آدم چغتائی، منور احمد کنڈے، رضیہ اسمٰعیل برمنگھم، رند ملک کنیڈا، اسلم ناصر آسٹریلیا، اے حق یو کے ٹائمز، ثقلین مبارک آسٹریلیا، رانا مبارک احمد بحرین، بشیر احمد خان سویڈن، راجہ منیر احمد، ڈاکٹر منصور خوشتر بھارت، منور احمد خورشید۔

گزارش

ہم سب اہل علم احباب کی خدمت میں گذارش کرتے ہیں کہ اپنے ادبی فن پارے، غزل، نظم، افسانہ، مشاعرے کی روئیداد وغیرہ جو بھی اِن پیج میں ارسال کیا جائے گا۔بلاتفریق اسے معیار کے مطابق شائع کیا جائے گا۔جو دوست بھیجتے ہیں اُن کی قدر کی جاتی ہے۔قندیل ادب تمام ممالک جہاں اسے قارئین موجود ہیں تقریباً دو لاکھ قارئین تک جاتا ہے اور ویب سائٹ سے بھی پڑھا جاتا ہے۔ہماری کوشش ہے کہ ہم نادر اور نئی تخلیقات کو اس میگزین میں جگہ دیں۔اور ہر بھیجنے والوں کی حوصلہ افزائی کریں، اور اس میگزین کا معیار بھی عوامی کریں۔ہر ادیب و شاعر، نقاد، افسانہ نگار، اُردو کے خدمتگار کی عزت افزائی کریں۔ہمیں کوئی صلہ مقصود نہیں۔اگر آپ نے کوئی کتاب لکھی ہے تو اس کا نام اور تعارف لکھ بھیجیں۔اگر آپ کے پاس ادبی فن پارہ کوئی نہیں تو اپنے ریمارکس ہی ارسال کر دیا کریں تا کہ ہم اپنا محاسبہ کرتے رہا کریں۔شکریہ۔

رانا عبدالرزاق خاں

نامے جو میرے نام آتے ہیں

ساجد محمود رانا لندن سے لکھتے ہیں۔

رانا صاحب السلام وعلیکم۔اللہ تعالیٰ آپ کو خوش رکھے۔جولائی کا قندیل ادب ملا۔کس کس غزل اور کس کس شاعر کے انتخاب پر آپ کو شاباش دوں۔نثر پارے تو بہت ہی منفرد تھے۔امجد مرزا کے افسانچے اور انشائیے پڑھ کر بہت مزہ آیا۔ہر قسم کی معلومات سے یہ قندیل ہمیشہ روشن رہے۔اور جہان ادب کو مدام روشن رکھے۔اور اللہ تعالیٰ آپ کی اس بے لوث خدمت کو قبول کر کے آپ کی زندگی میں صحت اور برکت دیتا رہے آمین۔

محترم سرافتخار احمد ایاز صاحب لندن سے رقم طراز ہیں۔

محترم رانا عبدالرزاق خان اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ خوش وخرم رکھے۔اور قندیل ادب کو ہمشہ روشن رکھنے کی توفیق دیتا رہے۔یہ عظیم خدمت ادب ہے جو آپ بے لوث بجالا رہے ہیں۔رمضان کا مبارک مہینہ گزر رہا ہے۔عیدالفطر کے موقع پر پچاس پونڈ کا حقیر تحفہ پیش خدمت ہے۔براہ مہربانی قبول فرمائیں۔

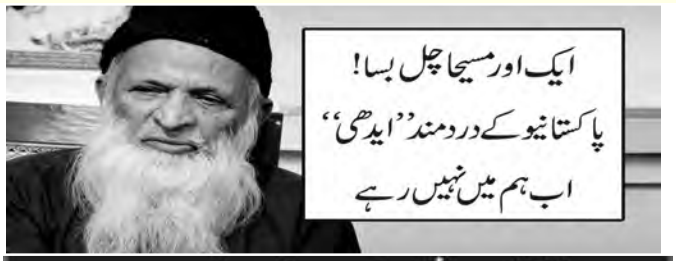

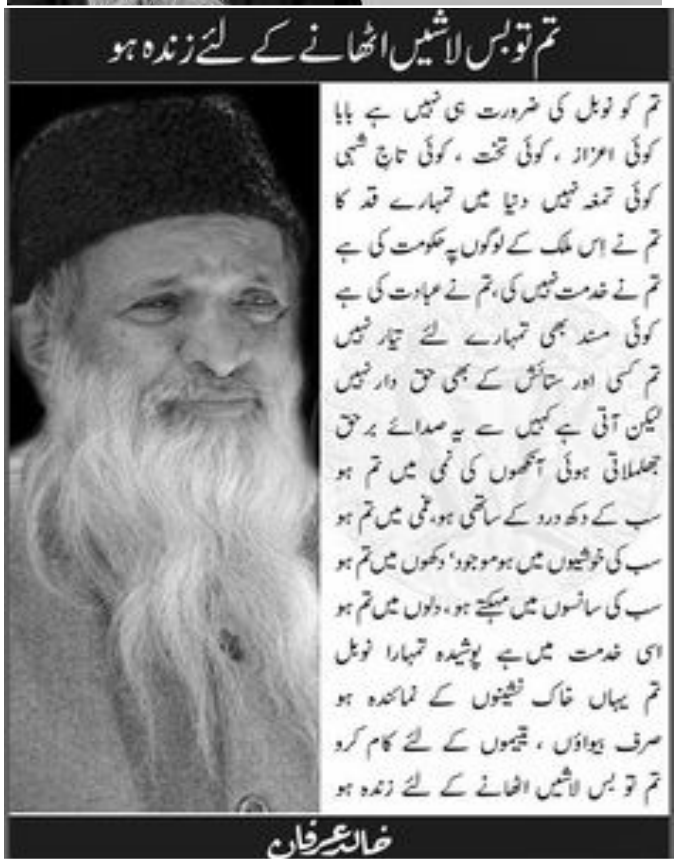

غزل۔سہیل احمد لون

گردشِ وقت سے نکل کر بھی
ہم نہ سنبھلے کبھی سنبھل کر بھی
اپنی پہچان بر قرار رکھی
تیرے سانچے میں ہم نے ڈھل کر بھی
ہم رہے دور منزلوں سے سدا
لاکھ رستے یہاں بدل کر بھی
وہ قدم سے قدم ملا نہ سکا
عمر بھر میرے ساتھ چل کر بھی
اک کرن روشنی بڑھا نہ سکا
دیپ سورج کے ساتھ جل کر بھی

غزل۔عبدالجلیل عباد

لکھے یہ کس نے بے درد لمحے مسافتوں کے مرے بدن پر
بنائے کس نے گھروندے اتنے فرقتوں کے مرے بدن پر
اُداس نسلوں کی قسمتوں میں اُداس رہنا بھی لکھ دیا ہے
دکھائی دیتے ہیں نقش سارے یہ ہجرتوں کے مرے بدن پر
ہوئے بے چہرہ وطن سے آکے یہاں یہ خانہ بدوش بن کے
بنے ہیں کیسے یہ خال و خد اب اذیّتوں کے مرے بدن پر
میں کس سے پوچھوں کہاں میں ڈھونڈوں
جو خواب میرے بکھر گئے تھے
جلائے کس نے ہیں اتنے سورج
یہ حسرتوں کے مرے بدن پر
کوئی تو آکے رکھے انگارے ٹھٹھرتی شب کی ہوا پہ آکے
رکھے کوئی تو یہ جلتے لب اب حرارتوں کے مرے بدن پر

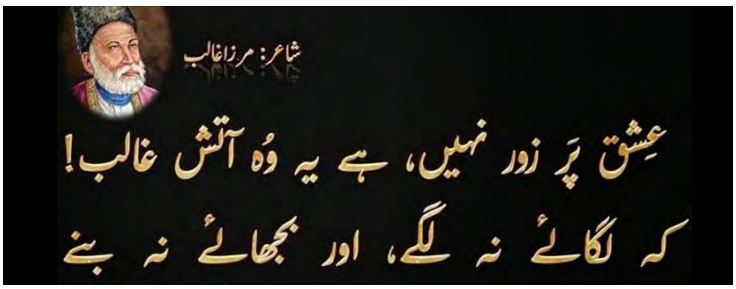

غـــزل

غزل۔فیض احمد فیض

غم بہ دل،شُکر بہ لب مست وغزل خواں چلیئے
جب تلک ساتھ ترے عمر گریزاں چلیئے
رحمت حق سے جو اس سمت کبھی راہ ملے
سُوئے جنت بھی براہِ رہِ جاناں چلیئے
نذر مانگے جو گلستاں سے خداوندِ جہاں
ساغر مے میں لئے خونِ بہاراں چلیئے
جب ستانے لگے بے رنگیں دیوارِ جہاں
نقش کرنے کوئی تصویرِ حسیناں چلیئے
کچھ بھی ہو آئینہ دل کو مصفّا رکھیئے
جو بھی گزرے ،مثلِ خسروِ دوراں چلیئے
امتحاں جب بھی ہو منظور جگر داروں کا
محفلِ یار میں ہمراہِ رقیباں چلیئے

غزل۔احمد فراز

تم اپنے عقیدوں کے نیزے
ہر دل میں اُتارے جاتے ہو
ہم لوگ محبت والے ہیں
تم خنجر کیوں لہراتے ہو
اس شہر میں نغمے بہنے دو
بستی میں ہمیں بھی رہنے دو
ہم پالنہار ہیں پھولوں کے
ہم پیار سکھانے والے ہیں
اس شہر میں پھر کیا دیکھو گے
جب حرف یہاں مر جائے گا
جب تیغ پہ لے کٹ جائے گی
جب شعر سفر کر جائے گا
جب قتل ہوا سُر سازوں کا
جب کال پڑا آوازوں کا
جب شہر کھنڈر بن جائے گا
پھر کس پہ سنگ اُٹھاؤ گے
اپنے چہرے آئینوں میں
جب دیکھو گے ڈر جاؤ گے

غزل۔احمد ندیم قاسمی

گل ترا رنگ چرا لائے ہیں گلزاروں میں
جل رہا ہوں بھری برسات کی بوچھاڑوں میں
مجھ سے کترا کے نکل جا مگر اے جانِ حیا
دل کی لو دیکھ رہا ہوں ترے رُخساروں میں
حسن بیگانۂ احساسِ جمال اچھا ہے
غنچے کھلتے ہیں تو بک جاتے ہیں بازاروں میں
ذکر کرتے ہیں ترا مجھ سے بعنوانِ جفا
چارہ گر پھول پرو لائے ہیں تلواروں میں
مجھ کو نفرت سے نہیں، پیار سے مصلوب کرو
میں تو شامل ہوں محبت کے گنہگاروں میں

غزل۔حبیب جالب

ہم نے سنا تھا صحنِ چمن میں کیف کے بادل چھائے ہیں
ہم بھی گئے تھے جی بہلانے،اشک بہا کر آئے ہیں
پھول کھلے تو دل مرجھائے شمع جلے تو جان جلے
ایک تمہارا غم اپنا کر کتنے غم اپنائے ہیں
ایک سلگتی یاد، چمکتا درد، فروزاں تنہائی
پوچھ نہ اس کے شہر سے ہم کیا کیا سوغاتیں لائے ہیں
سوئے ہوئے جو درد تھے دل میں آنسو بن کر بہ نکلے
رات ستاروں کی چھاؤں میں یاد وہ کیا کیا لائے ہیں
آج بھی سورج ڈوب گیا بے نور اُفق کے ساگر میں
آج بھی پھول چمن میں تجھ کو بن دیکھے مرجھائے ہیں
ایک قیامت کا سناٹا ایک بلا کی تاریکی
اُن گلیوں سے دور نہ ہنستا چاند نہ روشن سائے ہیں
پیار کی بولی بول نہ جالبؔ اس بستی کے لوگوں سے
ہم نے دکھ کی کلیاں کھو کر دکھ کے کانٹے پائے ہیں

غزل۔منیر نیازی

اُگا سبزہ در و دیوار پر آہستہ آہستہ
ہوا خالی صداؤں سے نگر آہستہ آہستہ
گھرا بادل خموشی سے خزاں آثار باغوں پر
ہلے ٹھنڈی ہواؤں میں شجر آہستہ آہستہ
بہت ہی سست تھا منظر لہو کے رنگ لانے کا
نشاں آخر ہوا یہ سرخ تر آہستہ آہستہ
مرے باہر فصیلیں تھیں غبارِ خاک و باراں کی
ملی مجھ کو ترے غم کی خبر آہستہ آہستہ
چمک زَر کی اسے آخر مکانِ خاک میں لائی
بنایا ناگ نے جسموں میں گھر آہستہ آہستہ
منیرؔ اس ملک پر آسیب کا سایہ ہے یا کیا ہے
کہ حرکت تیز تر ہے اور سفر آہستہ آہستہ

غزل۔مبارک احمد عابد

لبوں پہ جو کرنیں محبت کی بے حساب لئے
وہ آیا بزم میں چاہت کا آفتاب لئے
جو اس کے ہیں یوں اس کے چاہنے والے
ستارے جیسے ہوں جھرمٹ میں ماہتاب لئے
جو تجھ کو پانا ہے کچھ، اس کی خاکِ پا ہوجا
کہ یہ وجود ہے سجدوں میں انقلاب لئے

بڑا بے معنی ہے تنہا سفر اُجالوں کا
مزا تو جب ہے چلو سب کو ہم رَکاب لئے
کہیں سے ان کو بھی تعبیر کا دلاسا ملے
جو پیاسی آنکھوں میں پھرتے ہیں تیرے خواب لئے
میرے ہر اشک میں چاہت تری ہے عکس پذیر
تیری شبیہہ ترا حسنِ لاجواب لئے
جو لکھی خط میں اسے دل کی کیفیت ہم نے
توسب حروف تھے اشکوں سی آب وتاب لئے
یہ انتظار کا بادل ضرور برسے گا
ہاں کھل اُٹھے گا رُخِ فصل گل گلاب لئے
یہ زردپتے ہرے ہوں گے عنقریب عابدؔ
دُکھے ہوئے ہیں جو دل آج اضطراب لئے

غزل۔جمیل الرحمن

عیار ہے اتنی مجھے سودائی کرے گی
کس کو تھی خبر کیا مری بینائی کرے گی
فرصت ہی نہیں ملتی اگر کارِ جہاں سے
کیا مل کے مجھے ساعتِ تنہائی کرے گی
شمشیر کے دستے پہ گرفت اپنی ہے جب تک
ٹوٹی ہوئی تلوار بھی دارائی کرے گی
ہم نے تو ذرا رنگ ملانے ہیں بدن کے
تصویر کی تکمیل تو رُسوائی کرے گی
اب جینے کی خواہش ہی نہیں رہ گئی دل میں
اب کون سی آواز مسیحائی کرے گی
جو فاصلہ اک خواب سے اک خواب تلک ہے
ملے کیسے اسے عمر کی پروائی کرے گی
کردے گی جمیلؔ ایک گلِ سُرخ سے پتھر
کرنے کو تو میری وہ پذیرائی کرے گی

غزل۔منور احمد کنڈے

اکھیاں اندر خشک سمندر لے کے آیاں
پانی دے تھاں بھر کے پتھر لے کے آیاں
انساناں چوں کم دا بندا لبھاّ ناں
دُدھ تے دین گے، گائیاں ڈنگر لے کے آیاں
سِکھ جاساں ہن کیویں شرارت کرنی ایں
بھانڈے ٹینڈے وچ کے باندر لے کے آیاں
مہماناں دی خبر نہ کانواں مُڑ دِتی
خط لِکھاں گا آپ کبوتر لے کے آیاں
کناں تیک نہ پہنچے بانگ مسیتاں دی
کلغی والا لبھ کے کُکڑ لے کے آیاں
ہاسے دی سی گل نہ کوئی موقع سی
ہاسا منہّ تے تیری خاطر لے کے آیاں
دل دی راہ تے تھکا ٹٹا رہندا سی
یاد دا راہی پار سمندر لے کے آیاں
بے گھر پھر دا مجنوں وانگ منورؔ سی
گھر اپنے ایہہ مست قلندر لے کے آیاں

غزل۔فاخرہ بتول

وہ دل کو توڑ گیا بے شعور ایسا تھا
لبوں پہ آ نہیں پایا قصور ایسا تھا
گلاب ہاتھ سے گر کر زمیں بوس ہوا
نظر کا زاویہ سچ مچ طور ایسا تھا
اندھیرے موندھ کے آنکھیں دیئے بجھانے لگے
کہ میرے چاروں طرف ایک نور ایسا تھا
وہ جھوٹ بول کے سقراطِ عصر بن بھی چکا
اُسے بھی اپنی زباں پر عبور ایسا تھا
گناہگارِ محبت سے رابطہ نہ رہا
مرا مزاج بھی جنت کی حور ایسا تھا
بس اُس نے ہاتھ کو چھو کر کہا خدا حافظ
وجود ڈول گیا تھا سرور ایسا تھا
مری صدا سے بھی نا آشنا رہا وہ بتولؔ
وہ مرے دل کا مکیں مجھ سے دور ایسا تھا

عورت۔نامعلوم شاعر

مندر مسجد جانے والو
عورت کا حق کھانے والو
اس بت میں جان نہیں ہے
کیا عورت انسان نہیں ہے
اس کے ہاتھوں جھولنے والو
احسانوں کو بھولنے والو
اس کی کوئی شان نہیں ہے
کیا عورت انسان نہیں ہے
بیٹی کو شر جاننے والو
رب سے بیٹا مانگنے والو
اس کا رب رحمان نہیں ہے
کیا عورت انسان نہیں ہے

ظاہر لہڑی۔اجنبی

شہر میں عالم تماشا ہے
پھر سے میخ وصلیب لائے ہیں
خوب دا رورَسن سجائے ہیں
اور لبریز زہر کے پیالے
حاکمِ وقت غیض و غصے میں
جرم شاید بڑا بھیانک ہے
گر گیا کیوں نہ آسماں لوگو!
کوئی سچ بولا ہے یہاں لوگو
یہ میرے شہر کا نہیں ہوگا
ورنہ سچ بولتا بھلا کیسے
اجنبی ہے یہ صاف ظاہر ہے

غزل۔مظفر احمد مظفر

چھلکے تھے کبھی جام مجھے یاد نہیں ہے
اے گردشِ ایام! مجھے یاد نہیں ہے
اک صورتِ زیبا تھی مجھے یاد ہے لیکن
تھا اُس کا کوئی نام مجھے یاد نہیں ہے
مہتاب کی صورت تھا کوئی پیکرِ پُر نور
اُترا تھا لبِ بام مجھے یاد نہیں ہے
میں تھا یا کوئی مجھ سا کہیں خاک بہ صحرا
روتا تھا سرِ شام مجھے یاد نہیں ہے
کچھ لوگ مجھے لے کے چلے تھے سرِ مقتل
پھر کیا ہوا انجام مجھے یاد نہیں ہے
پھر پوچھنے آئی ہو مظفرؔ کا پتہ تم
کہہ تو دیا ''مادام'' مجھے یاد نہیں ہے

غزل۔عامر حسنی

''کون کہتا ہے محبت کی زباں ہوتی ہے''
یہ محبت تو اداؤں کی کماں ہوتی ہے
جس کی چاہت کہیں پنہاں رہی تیرے دل میں
اسکی ہر ایک ادا شعلہ بیاں ہوتی ہے
دل سے دل جوڑ رکھوں روح کے اندر اتروں
دل کی ایک ایک نگہ جس پہ عیاں ہوتی ہے
دل کی آنکھوں سے جسے دیکھتا آیا ہر دم
قربِ قامت دمِ عاشق پہ گماں ہوتی ہے
گل کی رنگینی تبسم بھی ہے شیرینی بھی
لب جو کھولے تو حلاوت ہی نہاں ہوتی ہے
جس کو پانے کو میں لٹتا ہوا مرتا آیا
اس کی آمد پہ نہیں منہ میں زباں ہوتی ہے
پھول جھڑتے ہیں زباں سے جو کبھی ہو گویا
اس کے انفاس میں اک روح رواں ہوتی ہے
جس کے تاروں بھرے مسکن کو جلانا چاہو
کون جانے اسی آنگن میں اماں ہوتی ہے
عامرؔ ایک ایک ادا مجھ کو کرے ہے گھائل
حشر ساماں کی جگہ دل میں یہاں ہوتی ہے

غزل۔آدم چغتائی

بھلاوے میں نہ ہم آتے،ہمارا بھی جہاں ہوتا
زمیں کی کیا ضرورت تھی،فقط اک آسماں ہوتا
یہی ہوتا کہ خود پہ نور کا وہم و گماں ہوتا
حیاتِ جاودانی کا تصور رائیگاں ہوتا
نہ دل ہوتا نہ جاں ہوتی،نہ قدرت مہرباں ہوتی
فلک پر کہکشاں کا قافلہ نہ ضوفشاں ہوتا
یہی ہوتا کہ ہر دم نور کی کرنوں میں ہم رہتے
ہماری دسترس میں کاش کہ اپنا مکاں ہوتا
یہی ہوتا کفِ صیّاد سے دامن بچا رہتا
نہ کچھ دردِ دروں ہوتا، نہ کچھ سوزِ نہاں ہوتا
جو یوں ہوتا تو کیا ہوتا، نہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا
نہ ہر شہ کی طلب ہوتی نہ دل کا امتحاں ہوتا
نہ جنت بھی کسی آدمؔ کے دامن میں بچھی ہوتی
نہ ہوتا جام کوثر کا، نہ ساقی مہرباں ہوتا

غزل۔سوہن راہی

تن پہ تیری پیاس اوڑھ کے گاتی ہوں
میں تیری مسکان لئے مسکاتی ہوں
میرے نینن تیرے چاند ستارے ہیں
تیری سوچ کو نیل گگن پہناتی ہوں
تیرے گیتوں کی مدماتی مدرا کو
دن رینا ں پیتی اور پلاتی ہوں
تن درپن کا پانی اور دمک اُٹھے
جب میں تیرے نین سے نین ملاتی ہوں
تنہائی میں جب نام تیرا دہراتی ہوں
میں اپنی پرچھائی سے ڈر جاتی ہوں
پیتم تیری پایل کیا کیا شور کرے
پھول پھول جب رُوپ میں تیرا پاتی ہوں
جیون سُر ریکھا ہے تیرے بولوں سے
راہیؔ تیری چپ سے میں مر جاتی ہوں

غزل۔احمد منیب

خود کو شرمندہ نہ کر خود سے تقاضا کر کے
اور بے پرد نہ ہو آپ سے پردہ کرکے
کیا کسی پیڑ سے دیوار سے سایہ مانگے
دل تو خود سایہ ہوا یاد کو سایہ کرکے
ہم پہ کھل جائے گا اک روز جگر کا رونا
رُوح سے گھاؤ کو دیکھیں گے اکیلا کرکے
دل کو ہے پرسش احوالِ تمنا کا خیال
کیا کرے جو کوئی دیکھے بھی تمنا کرکے
اپنی تنہائی نے کیا کھول رکھے ہیں بازو
کیا ملے گا تجھے لوگوں میں تماشا کرکے
میں تو اخلاص میں کرتا تھا تلاوت تیری
رکھ دیا تو نے مرے دل کو نہتا کرکے
لُٹ گئے ہم تو ترے نام کا صدقہ کرکے
ہم کو خوشیوں نے بھی مارا ہے تو تنہا کرکے

غزل۔انجم شہزاد

قتل گاہ کا گماں سا ہے دربار پر
پھول نازک بھی کٹنے لگے دار پر
بے سبب لب پہ آتی نہیں ہے ہنسی
مسکرانا پڑا ہے یوں ستمِ یار پر
جس نے ٹوٹے نہ انجم اناؤں کا گھر
مسکراؤں گا میں اپنی اُس ہار پر
کیسے دستور ہیں تیرے ایوان کے
اتنی پابندیاں سچ کے اظہار پر

غزل۔عبدالمجید ظفر

جو دین سکھاتے تھے وہ علم سے عاری ہیں
گفتار ہے زہریلی، الفاظ بازاری ہیں
حق گوئی سے بے بہرہ باطل کے حواری ہیں
پوچھیں جو وجہ اُس کی کہہ دیتے ہو امریکہ
ہے شوقِ کفر سازی جو فتوے لگانے کی
اُمت کی اکائیوں کو آپس میں لڑانے کی
ممبر پہ کھڑے ہو کر سلواۃ سنانے کی
پوچھیں جو وجہ اُس کی کہہ دیتے ہو امریکہ
ہر ملکِ مسلماں میں یوں دست و گریباں ہیں
شہ زور کے ہاتھوں سے کمزور پریشاں ہیں
اخلاق و وفاداری اُلفت سے گریزاں ہیں
پوچھیں جو وجہ اُس کی کہہ دیتے ہو امریکہ

غزل۔ ڈاکٹر سید صفیر صفی

میرا حرف حرف لہولہو

مجھے خط ملا ہے غنیم کا بڑی عجلتوں میں لکھا ہوا
کہیں رنجشوں کی کہانیاں دھمکیوں کا ہے سلسلہ
مجھے کہہ دیا ہے امیر نے کرو حسنِ یار کا تذکرہ
تمہیں کیا پڑی ہے کہ رات دن کہو حاکموں کو بُرا بھلا
تمہیں فکرِ عمر عزیز ہے تو نہ حاکموں کو بُرا کہو
جو امیر شہر کہے تمہیں وہی شاعری میں کہا کرو
کوئی واردات کہ دن کی ہو کوئی سانحہ کوئی رات ہو
نہ امیر شہر کا ذکر ہو نہ غنیم وقت کی بات ہو
کہیں تار تار ہوں عصمتیں میرے دوستوں کو نہ دوش دو
جو کہیں ہو ڈاکہ زنی اگر تو نہ کوتوال کا نام لو
کسی تاک میں ہیں لگے ہوئے میرے جاں نثار گلی گلی
ہیں میرے اشارے کے منتظر میرے عسکری میرے لشکری
جو تیرے جیسے جوان تھے کبھی میرے آگے رُکے نہیں
انہیں اس جہاں سے اُٹھا دیا جو میرے آگے جھکے نہیں
جنہیں مال و جان عزیز تھے وہ تو میرے ڈر سے پگھل گئے
جو تمہاری طرح اُٹھے بھی تو انہیں بم کے شعلے نگل گئے
میرے جاں نثاروں کو حکم ہے کہ گلی گلی یہ پیام دیں
جو امیر شہر کا حکم ہے اسے بنا اعتراض مان لیں
جو میرے مفاد کے حق میں ہیں وہی دلیہ میں رہا کریں
مجھے جو بھی دل سے قبول ہو سبھی فیصلے وہ ہوا کریں
جنہیں مجھ سے کچھ نہیں واسطہ انہیں اپنے حال پہ چھوڑ دو
وہ جو سرکشی کے ہوں مرتکب اُنہیں گردنوں سے مروڑ دو
وہ جو بے ضمیر ہیں شہر میں اُنہیں زر کا سکہ اُچھال دو
جنہیں اپنے درش عزیز ہیں انہیں کال کوٹھڑی میں ڈال دو
جو میرا خطیب کہے تمہیں وہی اصل ہے اُسے مان لو
جو میرا امام بیاں کرے وہی دین ہے سبھی جان لو
جو غریب ہیں میرے شہر کے انہیں بھوک پیاس کی مار دو
کوئی اپنا حق جو طلب کرے تو اسے زمیں میں اُتار دو
جو میرے حبیب و رفیق ہیں انہیں خوب مال و منال دو
جو میرے خلاف ہیں بولتے انہیں نوکری سے نکال دو
جو ہیں بے خطا وہی در بدر یہ عجیب طرزِ نصاب ہے
جو گناہ کریں وہی معتبر یہ عجیب روزِ حساب ہے
یہ عجیب ہے رُت بہار کی کہ ہر ایک زیرِ عتاب ہے
کہیں پر شکستہ ہے فاختہ کہیں زخم زخم گلاب ہے
میرے دشمنوں کو جواب ہے نہیں غاصبوں پہ شفیق میں
میرے حاکموں کو خبر کرو نہیں آمروں کا رفیق میں
مجھے زندگی کی ہوس نہیں مجھے خوفِ مرگ نہیں ذرا
میرا حرف حرف لہو لہو، میرا لفظ لفظ ہے آبلہ

غزل۔نامعلوم

گونگی ہو گئی آج کچھ زبان کہتے کہتے
ہچکچا گیا خود کو مسلمان کہتے کہتے
یہ بات نہیں کہ مجھ کو اس پر یقیں نہیں
بس ڈر گیا خود کو صاحبِ ایمان کہتے کہتے
توفیق نہ ہوئی مجھ کو اک وقت کی نماز کی
شرم سے پانی ہوا مؤذن اذان کہتے کہتے
کسی کافر نے جو پوچھا ہے کونسا مہینہ
شرم سے پانی ہا تھ سے گر گیا رمضان کہتے کہتے
میری الماری میں گرد سے اٹی کتاب کا جو پوچھا
میں گڑ گیا زمین میں قرآن کہتے کہتے
یہ سن کر اقبالؔ چپ سادھ لی اس نے
یوں لگا جیسے رُک گیا وہ مجھے حیوان کہتے کہتے

غزل۔حمیدہ معین رضوی

تھا لمحے بھر کا فیصلہ پچھتائی عمر بھر
لپٹی رہی ہوں درد کی چادر میں عمر بھر
ہم مات کھا چکے کہ سیاست کا گُر نہ تھا
اب پیٹتے لکیر رہیں چاہے عمر بھر
جانے کھلے گی آنکھ کبھی ، سوچتی رہی
چلتی رہی ہوں خواب میں لگتا ہے عمر بھر
صحرا میں وقت کی یہ بھٹکتا ہوا بشر
جس کے ارادے ٹوٹتے رہتے ہیں عمر بھر
جانے مروتیں تھیں کہ یہ بزدلی تھی
جو کہہ پائے ہم نہ بات جو کہنی تھی عمر بھر

غزل۔قیصر شیراز

یقین تھا کہ گمان تھا عجب حوصلوں کی اُڑان تھا
چلا سوئے دار مسکرا کر ،ظرف کتنا کمال تھا
کڑی دھوپ،تیرگیِ عشق میں وہ سر بکف
خراماں ،خراماں چل کر بہت نڈھال تھا
بھری بزم میں کوئی آہ نکلی دَم بدم
پئے مرگ اجنبی کے شاید اٹکا کوئی سوال تھا
خزاں کے پتے سمیٹ کر یوں کھلی فضاؤں میں اُچھالنا
حقیقتوں سے تھی آشنائی یا کوئی غرض مثال تھا

عجب وسوسوں کا شکار ہوں تم ہی کچھ کرو بیاں
سرِ راہ اُس کا ہاتھ کھینچنا، مرا عروج تھا کہ زوال تھا
نوکِ خار پہ رقصاں رہے پیہم جذباتِ شیراز
ہزار شکوے تھے گفتنی، رو کے تیرا ہی تیرا خیال تھا

غزل۔عاصی صحرائی

قریبِ شام جب دھیمی ہوائیں گل پہ چلتی ہیں
میانِ گل میں یادیں پھول بن کے جب مچلتی ہیں
شفق پہ تیرگی بھی لڑ کھڑا کے آہیں بھرتی ہے
طلسمی وادیوں میں آگ سی گویا مچلتی ہے
سفینے ڈوبتے ہیں آنکھ کے گہرے سمندر میں
پرانی داستانیں گھومتی ہیں دل کے مندر میں
لرزتے ہیں ستارے چاندنی پر زردی چھائی ہے
ہوا کے دوش پر پھر جھونپڑوں میں سردی آئی ہے
فضا کو کپکپا کر جب گھٹائیں رُخ بدلتی ہیں
گرجتے گونجتے بادل میں جا کر دھمکتی ہیں
پجارن بتکدے میں آس کے جب دیپ جلاتی ہے
وہ اپنا درد لے کر بتکدے کو کھٹکھٹاتی ہے
ہوا کے زور سے تادیر ٹہنی تھر تھراتی ہے
"مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے"

غزل۔ہادی مونس

محبت میں اگر تابِ جنوں ہے
مردوں تک رسائی کا شگوں ہے
سکوں ملتا نہیں فانی جہاں میں
حیاتِ جاودانی پر سکوں ہے
جسے سمجھا ہے کوئی جیت اپنی
فقط اک مسکراہٹ کا فسوں ہے
کوئی نفرت میں حد سے بڑھ گیا ہے
کوئی چاہت میں خستہ و زبوں ہے
محبت میں بہت بے چین و بسمل
کہ دل کا درد جب ہوتا فزوں ہے
گلستانوں میں صحراؤں میں ڈھونڈا
مگر وہ بیٹھا دل کے اندروں ہے
بدلتا جا رہا ہے ہر زمانہ
جوانی کی محبت جوں کی توں ہے

غزل۔ابنِ ریاض

مدت ہوئی انسان کو انسان ہوئے
ابلیس کو زمانہ ہوا شیطان ہوئے
کچھ تذکرے درندوں کے گھناؤنے
تاریخ کے مسخ ہوتے ہوئے نشان ہوئے
ہر دور ظلمت کا تاریک سیاہ رہا
عوام تو ہر دور میں پریشان ہوئے
کہیں جھگڑا رنگ کا کہیں مذہب کا
کرب و بلا کے اوراق داستان ہوئے
انسانیت ناپید رہی، دنیا گم سُم رہی
حق گو مرتے رہے مورّخ حیران ہوئے
جو دعویٰ کے اشرف المخلوقات تھے
ان کی رحمتوں کے جذبے بے جان ہوئے
مسلم بڑھتے رہے بندے بندے نہ رہے
کافر رحمدل رہے، مومن حیوان ہوئے
شکوک کے دھارے بہتے رہے یہاں وہاں
چراغ گل ہوئے، گلشن ویران ہوئے

غزل۔ارشاد نیازی

وحشت کی داستاں کو سرِ صبح چھیڑ کر
دل کے دکھائے زخم بدن کو اُدھیڑ کر
جب ایک آئینے نے کہا ٹوٹتا ہوں میں
سہا تھا اک عکس بھی دامن سکیڑ کر
لوٹ آؤں گا شام کے ڈھلنے سے پیشتر
سینہ ٔ دشت میں کوئی خنجر گھسیڑ کر
کیا ہے ستم کہ پھر سے حساب و کتاب ہو
دنیا کے سارے جھگڑے جب آؤں نبیڑ کر
شاخوں سے وحشتوں کی لپک ہی ٹپک پڑے
اُونچا تو اس قدر بھی نہ ہجرت کا پیڑ کر

اُسے عید مبارک کہتی ہوں

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ

پھر اک لمحہ وہ بھی آیا
جب میرا چاند ہی ماند ہوا
کوئی دید رہی، نہ ہی عید رہی
نہ ہی خوشیوں کی امید رہی
پھر عید نہ اُتری آنگن میں
اک لمحہ ایسے محیط ہوا
میں اپنی ذات میں سمٹ گئی
اور خوشیوں کی ہر اک رُت پھر
مرے دروازے سے پلٹ گئی
لیکن جب عید کا دن آئے
وہی لمحہ لوٹ کے آتا ہے
وہی لہجہ لوٹ کے آتا ہے
وہی چاند نظر میں سماتا ہے
کس حال میں اب وہ رہتا ہے
کس حال میں اب میں رہتی ہوں
اُسی دھارے میں بس بہتی ہوں
اُسے عید مبارک کہتی ہوں
اُسے عید مبارک کہتی ہوں

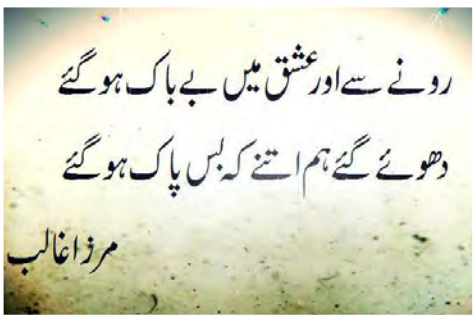

غزل۔شائق نصیر پوری

خون تو سارا پی گئیں تیرا یہ حاکم جونکیں
رہ گیا لاشہء بیدم دیکھا نہیں جاتا
سر پر چھت،تن پہ کپڑا نہ ہو تو نہ سہی شائقؔ
پھول جیسے بچوں کا شکم دیکھا نہیں جاتا
دُکھ کسی کو بھی پہنچے آنکھیں ہماری چھلک پڑتی ہیں
گزر رہا ہے قوم پر الم ، یہ الم دیکھا نہیں جاتا
یارب اب چھین لے ظالم نا خداؤں سے خدائی
عصمتوں،عفتوں کی انا کا ماتم دیکھا نہیں جاتا
بچوں کے گلے میں پڑے برائے فروخت کے بورڈ
ماں کی ممتا پر یہ سراسر ظلم دیکھا نہیں جاتا

غزل۔طارق احمد مرزا

نہ پُوچھ کیسا تھا کیا آب و تاب رکھتا تھا
حسیں تھا شوخ تھا ظالم شباب رکھتا تھا
’’خرد کا نام جنوں رکھ دیا ، جنوں کا خرد‘‘
فقیہہِ شہر تھا ، ذہنِ خراب رکھتا تھا
اور اس کی موت کا منظر عذاب تھا یارو
جو بانٹنے کے لئے بس عتاب رکھتا تھا
نہ جانے کیسا تھا معیارِ دوستی اُس کا
وہ دشمنوں کا حسیں انتخاب رکھتا تھا
تھا میرا سب سے بڑا جرم کم سخن ہونا
ہر اعتراض کا گرچہ جواب رکھتا تھا
پگھل کے جسم نے آخر بجھا دیئے شعلے
مزاج میرا بھی رنگِ خباب رکھتا تھا
وہ میرے خوابوں کی دنیا کی اک حقیقت تھا
جو میری جاگتی آنکھوں میں خواب رکھتا تھا
اب اُس کی آنکھ میں کانٹا بنے کھٹکتا ہوں
میں جس کی راہ میں ہر دم گلاب رکھتا تھا
جو باب اس کی محبت میں دل پہ ہم نے لکھا
کتابِ زیست کا لب لباب رکھتا تھا
لوٹانی پڑ گئی مجھ کو تمام تر سانسیں
وہ قرض دیتا تھا لیکن حساب رکھتا تھا
ورَق ورَق مجھے اَزبر ہے آج بھی طارقؔ
وہ ایک شخص جو چہرہ کتاب رکھتا تھا

غزل۔چوہدری محمد علی مضطرؔ عارفی

دیں جدا دینے لگے، دنیا جدا دینے لگے
جس قدر مانگا تھا اس سے کچھ سوا دینے لگے
جاں کا غم،جاناں کا غم،دنیا کا غم،عقبیٰ کا غم
کیا نہیں دیتا ہے جب میرا خدا دینے لگے
شاعری چھوڑو، قلم توڑو، کرو ترکِ وطن
ہم کو یہ احباب مل کر مشورہ دینے لگے
چاند بھی کھڑکی کے رستے آ گیا دالان میں
آہٹوں کو گھر کے آئینے صدا دینے لگے
پھول تھا تو پھول کے جذبات کا رکھتے خیال
تم اسے گلدان میں رکھ کر بھلا دینے لگے
جیتے جی کوئی کسی کا پوچھنے والا نہ تھا
مر گئے تو اپنے بیگانے دعا دینے لگے
ہاتھ رنگیں کر لیے پہلے ہمارے خون سے
پھر اِنھی ہاتھوں سے ہم کو خوں بہا دینے لگے
ساحلوں کے تشنہ لب بارش کی پہلی بوند کو
دیکھتی آنکھوں سمندر میں گرا دینے لگے
راستوں کے بے تکے پن کا نہیں کوئی علاج
دشت میں جا کر حوالہ شہر کا دینے لگے
قافیوں سے لڑ پڑے تو پھاڑ دی ساری غزل
جرم دیواروں کا تھا، گھر کو سزا دینے لگے
ہجر کے بیمار کو مضطرؔ! قرار آ ہی گیا
زخم پھر بھی زخم تھے،آخر مزا دینے لگے

غزل۔ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ

آج بھی برسوں بعد مرے
کانوں میں صدا تیری آئے
مَیں چاند ہوں جاناں، چاندہوں مَیں
سُن چاند ہوں تیری عید کا مَیں
پیغام ہوں ایک نوید کا مَیں
رنگوں سے سجی، خوشبو میں بسی
ہر دید کا اک انعام ہوں مَیں پیغام ہوں مَیں
وہ جو تیری صدا کا لمحہ تھا
مری ساکن روح میں اُتر گیا
اُس لمحے نے کیسے ہم کو شاداب کیا، نایاب کیا
دل کی بنجر جو مٹی تھی اس کو کیسے سیراب کیا
ہر خار کو پھول کیا اس نے
ہر ذرے کو مہتاب کیا
وہی لمحہ میری حیات بنا
وجہِ تکمیلِ ذات بنا
اسی اک لمحے میں آج تلک
مری روح کہیں پر اٹک گئی

غلام محمد قاصر کی بہت مشہور غزل

بغیر اس کے اب آرام بھی نہیں آتا
وہ شخص جس کا مجھے نام بھی نہیں آتا
اسی کی شکل مجھے چاند میں نظر آئے
وہ ماہ رُخ جو لبِ بام بھی نہیں آتا
کروں گا کیا جو محبت میں ہو گیا ناکام
مجھے تو اور کوئی کام بھی نہیں آتا
بٹھا دیا مجھے دریا کے اس کنارے پر
جدھر حبابِ تہی جام بھی نہیں آتا
چرا کے خواب وہ آنکھوں کو رہن رکھتا ہے
اور اس کے سر کوئی الزام بھی نہیں آتا

غزل-مبارک احمد عابد

لبوں پہ جو کرنیں محبت کی بے حساب لئے
وہ آیا بزم میں چاہت کا آفتاب لئے
جو اس کے ہیں یوں ہیں اس کے چاہنے والے
ستارے جیسے ہوں جھرمٹ میں ماہتاب لئے
جو تجھ کو پانا ہے کچھ، اس کی خاک پا ہو جا
کہ یہ وجود ہے سجدوں میں انقلاب لئے
بڑا ہے معنی ہے تنہا سفر اُجالوں کا
مزا تو جبھی ہے چلو سب کو ہم رکاب لئے
کہیں سے ان کو بھی تعبیر کا دلاسا ملے
جو پیاسی آنکھوں میں پھرتے ہیں تیرے خواب لئے
میرے ہر اشک میں چاہت تری ہے عکس پذیر
تیری شبیہہ تراحسن لاجواب لئے
جو لکھی خط میں اسے دل کی کیفیت ہم نے
تو سب حروف تھے اشکوں سی آب وتاب لئے
یہ انتظار کا بادل ضرور برسے گا
ہاں ِ کھل اُٹھے گا رخ فصل گل گلاب لئے
یہ زرد پتے ہرے ہوں گے عنقریب عابدؔ
دُکھے ہوئے ہیں جو دل آج اضطراب لئے

غزل-علی سردار جعفری

کام اب کوئی نہ آئے گا بس اک دل کے سوا
راستے بند ہیں سب کوچہ قاتل کے سوا
باعثِ رشک ہے تنہا روی ء رہرو شوق!
ہمسفر کوئی نہیں دوری ء منزل کے سوا
ہم نے دنیا کی ہر اک شے سے اُٹھایا دل کو
لیکن اک شوخ کے ہنگامہء محفل کے سوا
تیغ منصب ہو جہاں، دار و رسن ہو شاہد
بے گنہ کون ہے اس شہر میں قاتل کے سوا!
جانے کس رنگ میں آئی ہے گلشن میں بہار
کوئی نغمہ ہی نہیں شورِ سلاسل کے سوا

غزل-پروین شاکر

کو بہ کو پھیل گئی بات شناسائی کی
اس نے خوشبو کی طرح میری پذیرائی کی
کیسے کہہ دوں کہ مجھے چھوڑ دیا ہے اُس نے
بات تو سچ ہے مگر بات ہے رُسوائی کی
وہ کہیں بھی گیا لوٹا تو میرے پاس آیا
بس یہی بات ہے اچھی مر ے ہرجائی کی
تیرا پہلو بھی تیرے دل کی طرح آباد رہے
تجھ پہ گزرے نہ قیامت شب ِتنہائی کی
اس نے جلتی ہوئی پیشانی پر جب ہاتھ رکھا
رُوح تک آ گئی تاثیر مسیحائی کی
اب بھی برسات کی راتوں میں بدن ٹوٹتا ہے
جاگ اُٹھتی ہے عجب خواہش انگڑائی کی

غزل-آدم چغتائی کے چند مقطعے

آدمؔ زاد کے اس جنگل میں سارے رہتے ہیں دُشوار
آگے بڑھیں تو جان کا خطرہ،لوٹیں تو رُسوائی ہے
آدمؔ سفر کا کرب اُٹھا کر نہ اُف کرو
کیا سوچنا کہ دن ہے کٹھن، شب مہیب ہے
یہ حادثاتِ زمانہ یہ کشمکش آدمؔ
کبھی رُکے بھی ہیں گردش کے دن زمانے میں
جگر کے داغ چھپانے سے کب چھپے آدمؔ
یہ میرا درد مرا قیمتی خزانہ ہے
آدمؔ نے سر دار بھی حق بات کہی ہے
اظہار ِ حقیقت کی سزا بھی مجھے دو گے
آؤ آدمؔ ہم کریں صد شکر اُس کی ذات کا
اب غمِ دوراں کی شدت ہم کو تڑپاتی نہیں
یقین ہے یاس کی تاریکیاں چھٹ جائیں گی اک دن
مگر ظلمت سے آدمؔ ہم کو لڑنا ہی نہیں آتا
پُر پیچ تھے پُر خطر تھے جوانی کے راستے
آدمؔ یہ مرحلے کبھی آساں نہ کر سکا
ملے گی پیار کی منزل کبھی تو آدمؔ کو
دیارِ درد میں پھرتا ہے کب سے آوارہ
مری نگاہ میں آدمؔ بھی اک ستارہ ہے
خدائے پاک نے جسکو دیا ہے عجزو وقار
بھٹکتے پھرتے ہیں اہلِ نظر زمانے میں
یہ دور وہ ہے کہ آدمؔ کی آبرو ہی نہیں
ہم تو آدمؔ وقت کے دھارے میں یوں بہتے رہے
جیسے تنکا بہہ رہا ہو اک بڑے طوفان میں

طفیل عامر-پنجابی غزل

دُھپ کڑا کی سایہ کر
ڈے پھیرے پایا کر
ہوش ٹھکانے نہیں رہندے
میچے داٹُک کھایا کر
ہر اِک نوں توں اَڑیا دل دی گل سنایا کر
انج او ہنوں بدنام نہ کر
پیریں جُتی پایا کر
ربّ کرے! ربّ معاف کری
کیتے تے پچھتایا کر
تیرے بہانے تک دے ساں
"ماسی" بُھٹی تایا کر
عامر جتھے تاہنگاں نیں
او تھے ای توں جایا کر

امن کا سفیر سرافتخار احمد ایاز

ڈاکٹر صاحب موصوف نے اپنی زندگی بنی نوع انسان کی خدمت کیلئے وقف کی ہوئی ہے۔ یہ امن کے اور انسانیت کے سفیر ہے۔ ساری دنیا میں ان کے کارہائے نمایاں ہیں اور قابل ستائش بھی۔ ان کی ان کوششوں کو عالمی ادارے قدر کی نگاہ سے

خصوصی انٹرویو: محی الدین عباسی

دیکھتے ہیں اور ان پر بھرپور اعتماد بھی کرتے ہیں۔ اس نامور عظیم شخصیت کے حالات زندگی اور سماجی کارناموں کو بیان کرنے سے قبل اس تقریب کا پس منظر بیان کرنا بھی ضروری ہے۔ قارئین کی دلچسپی و معلومات کیلئے جس میں ان کو "سر" کا خطاب یعنی نائٹ کمانڈر کا اعزاز۔ 13 جون 2015ء کو یہ تقریب بکنگھم پیلس لندن میں منعقد ہوئی۔ ملکہ الزبتھ برطانیہ سال میں دوبار یہ اعزازات دیتی ہیں۔ ایک سال نو کے موقع پر دوسرا اپنی سالگرہ کے موقع پر جو سرکاری طور پر جون کے دوسرے ہفتے میں منائی جاتی ہے۔ ملکہ الزبتھ کی تاریخ پیدائش 21 اپریل 1926 کی ہے لیکن یہ سرکاری طور پر اس کو جون کے مہینہ میں منایا جاتا ہے۔ اعزازات دینے کی اس تقریب کو (Investiture) کہا جاتا ہے۔ پورے سال میں ایسی 25 تقریبات منعقد کی جاتی ہیں۔ 120 افراد یہ اعزازات حاصل کرتے ہیں۔ ایسی تقریب میں ملکہ اس تقریب میں اپنے دو افسروں اور 5 باڈی گارڈز کے ساتھ آتی ہیں۔ یہ طریق ملکہ وکٹوریہ نے 1876 میں شروع کیا تھا۔

اس تقریب میں ملکہ کے آنے سے قبل قومی ترانہ پیش کیا جاتا ہے۔ پھر ایک آفیسر ملکہ کے دائیں ہاتھ کھڑا ہو کر ہر اعزاز لینے والے کا باری باری اعلان کرتا ہے۔ اعزاز حاصل کرنے والا ایک ساتھ والے دروازے سے بال روم کے اندر داخل ہو کر ملکہ کے قریب کھڑا ہو جاتا ہے اور یہ اعلان بھی کیا جاتا ہے کہ یہ اعزاز اس کی کن خدمات کے طور پر دیا جا رہا ہے۔ ملکہ کے قریب ایک افسر ہاتھ میں Velvet کا ایک تکیہ لئے کھڑا ہوتا ہے۔ جس پر تمغہ یا اعزازی نشان لے کر ملکہ کی خدمت میں پیش کرتا ہے۔ دوسرا سینئر افسر اس تمغہ کو چیک کرتا ہے کہ یہ صحیح پیش کیا جا رہا ہے۔ پھر یہ تمغہ اس کو پہنا دیتی ہیں۔ اس دوران ملکہ اس سے کچھ گفتگو کرتی ہیں جو دو منٹ کی ہوتی ہے۔ جن کو بھی یہ نائٹ ہڈ کا اعزاز ملتا ہے۔ اس کے لئے ایک چھوٹا سٹول ہوتا ہے جس پر ایک خوبصورت Velvet تکیہ ہوتا ہے۔ وہ اس کے اوپر دایاں گھٹنا رکھ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ پھر ملکہ ان کو اپنے "Knights" میں شامل کرنے کے لئے ایک تاریخی تلوار سے ان کے دائیں اور بائیں کندھے کو چھوتی ہے یہ تلوار اس لئے کہ یہ ان کے والد محترم کنگ جارج ششم کے استعمال میں تھی۔ یہ اعزازات مختلف آرڈرز کے تحت دیئے جاتے ہیں اور ان میں سب سے زیادہ معروف 'آرڈر آف دی برٹش امپائر' ہے۔ اکثر لوگوں کو یہ اعزاز ملتا ہے اس طرح ڈاکٹر صاحب موصوف کا بھی اس سے بڑھ کر افسر کا رتبہ ہے اور پھر کمانڈر کا ہے۔ اور اس آرڈر کا اعلیٰ ترین ایوارڈ KBE یعنی نائٹ کمانڈر ہے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ "نائٹ ہڈ" کسی کو زندگی میں ایک ہی مرتبہ ملتا ہے۔ یہ ہردو اعزازات ڈاکٹر صاحب موصوف کے حصہ میں آئے ہیں۔ اور اس طرح یہ دنیا کے خوش قسمت لوگوں میں شامل ہیں۔ شاہی اعزازات میں سب سے اعلیٰ برٹش ایمپائر ہے۔ یہ بہادری اور اولوالعزمی پر دیا جاتا ہے۔ فوجی خدمات کے علاوہ سول سوسائٹی کی خدمات یا سائنس یا ٹیکنالوجی میں خاص خدمات کے طور پر یہ ایوارڈ جارج پنجم نے 4 جون 1917ء کو جاری کیا تھا۔

یہ اعزازات MBE سے شروع ہوتے ہیں اور اس سے اوپر OBE ہے پھر CBE۔ BE اور GBE نائٹ ہڈ کیساتھ (SiR) کا خطاب ہے۔ عورتوں کو DAME کا خطاب دیا جاتا ہے۔ ان اعزازات کیلئے ملکی وزیراعظم یا گورنر کی طرف سے ملکہ کی خدمت میں سفارش کی جاتی ہے۔ ایک سال میں ساری دنیا میں جہاں جہاں بھی ملکہ ہڈ آف سٹیٹ ہے زیادہ سے زیادہ 845 نائٹ کمانڈرز بنائے جا سکتے ہیں۔ دوسرے اعزازات کی تعداد 1 لاکھ ہے۔ لیکن نائٹ کمانڈوز کا اعزاز ملنے والوں کی تعداد بہت کم ہے۔

13 جون 2015ء کو بکنگھم پیلس لندن میں ملکہ برطانیہ کی یوم پیدائش کے موقع پر یہ ایوارڈ یعنی KBE نائٹ کمانڈر ڈاکٹر صاحب موصوف کو دیا گیا۔ مزید برآں انٹرویو کے دوران ڈاکٹر صاحب نے مجھے یہ بتایا کہ یہ محض اللہ تعالیٰ کا فضل اور جماعت احمدیہ کی برکات کا باعث تھا ان کا کہنا تھا کہ اس اعزاز کے ساتھ "SIR" کا خطاب بھی ہے۔ یہ تقریب صبح 10 بجے ہوئی اس میں میری بیگم صاحبہ امتہ الباسط اور دو بیٹیاں بشریٰ اور فرزانہ صاحبہ بھی شریک ہوئیں۔ اس تقریب کا انعقاد اسی طرز پر ہوا۔ مذکورہ بالا بیان کردہ۔

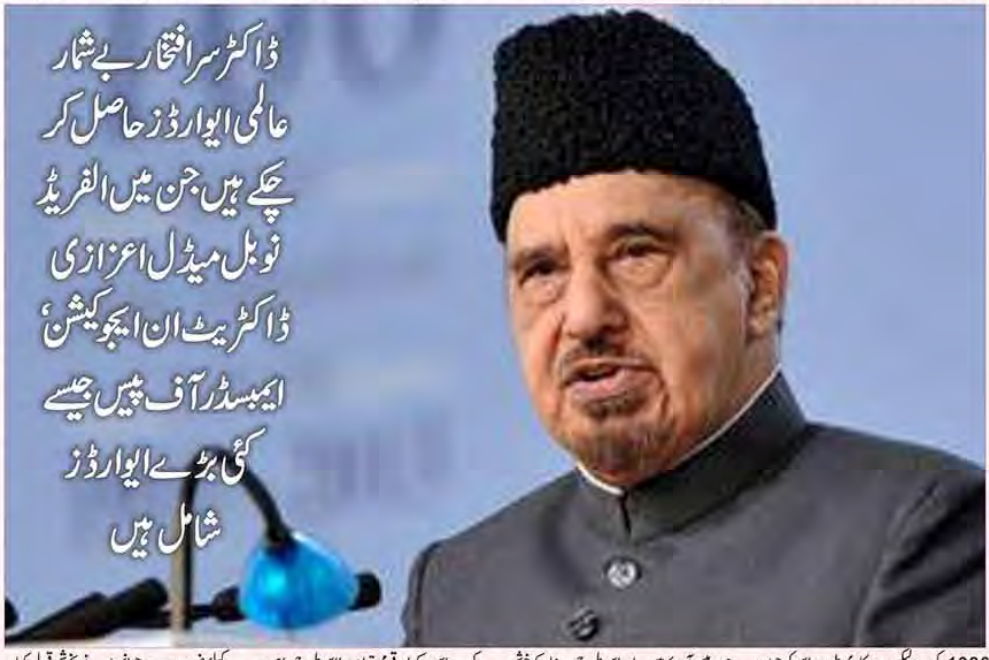

اس تقریب میں یہی ایک اعزاز یعنی برٹش آف دی ایمپائر KBE تھا جو ڈاکٹر صاحب موصوف کو دیا گیا۔ اس اثناء میں ملکہ سے جو دو منٹ کی گفتگو ہوئی ملکہ نے ان سے کہا میں پہلے بھی آپ کو تمغہ دے چکی ہوں اور تم نے (REALMS) کی بہت خدمت کی ہے۔ جس پر ڈاکٹر صاحب موصوف نے کہا ملکہ صاحب آپ سب سے زیادہ لمبا عرصہ فرمانروا رہی ہیں۔ مبارک بادی دی اور دعا دی کہ اللہ تعالیٰ آپ کو دونوں جہانوں کی برکتیں عطا کرے اس کے بعد قومی ترانہ ہوا اس طرح یہ اہمیت کی حامل تقریب اختتام پذیر ہوئی۔ اب ڈاکٹر صاحب موصوف کی ابتدائی زندگی حالات اور تعلیمی و سماجی خدمات پر روشنی ڈالتے ہیں۔ آپ برصغیر ہندوپاک بھیرہ علاقہ میں پیدا ہوئے۔ 1937ء میں والد صاحب مشرقی افریقہ چلے گئے تھے آپ 1946ء میں اپنے والد کے پاس چلے گئے یہ دوسری جنگ عظیم کا اختتام تھا۔ تانگانیکا تنزانیے

اسکول کی بزم اردو سوسائٹی کے صدر منتخب ہوئے۔ انہیں ان کی کارکردگی کی بناء پر بوائز اسکارٹ کوئنز کا ایوارڈ دیا گیا۔ میٹرک کے بعد ٹیچر ٹریننگ کورس کیا اس کے بعد ایکو وزارت تعلیم میں اسسٹنٹ انسپکٹر آف اسکول انگلش مقرر کیا گیا۔ یہ 1961 کی بات ہے اس وقت ان کے پاس برطانیہ کی شہریت تھی۔ پھر تھوڑے ہی عرصہ بعد آپ کو ترقی دے کر ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف اسکول بنا دیا گیا۔ اس کے ساتھ آپ کو Executive بورڈ کا بھی ممبر مقرر کر دیا۔ افریقہ کی بلند ترین چوٹی جو نیروبی کینیا میں ہے اس کا نام (KILIMANJARO) ہے اس کو سر کرنے کا بھی موقع ملا۔ 1956ء میں یہ 15 روزہ مشکل ترین سفر تھا جو الحمدللہ مکمل کیا۔ ان کے لئے یہ ایک بڑا اعزاز ہے۔ انہوں نے برٹش شہریت ترک کر کے تنزانیہ کی شہریت حاصل کر لی چونکہ تنزانیہ کے تعلقات برطانیہ سے خراب ہو گئے چونکہ برطانیہ جنوبی افریقہ کو اسلحہ سپلائی کر رہا تھا لہٰذا اس طرح ان کو سینئر پوسٹ مل گئی۔ کالج آف ایجوکیشن میں انگریزی کا ہیڈ بنا دیا گیا یہ ان کی قابلیت سے بڑھ کر تھی بہرصورت اللہ تعالیٰ نے فضل کیا ان کو برطانیہ میں اعلیٰ تعلیم کیلئے سکالرشپ مل گئی۔ مئی 1973ء کو یہ برطانیہ چلے گئے وہاں نیوکاسل یونیورسٹی میں بی ایڈ جنرل ڈگری کیلئے داخلہ مل گیا۔ یہ دو سالہ ڈپلومہ کورس تھا۔ اسی یونیورسٹی میں اعلیٰ کارکردگی اور انگریزی میں اوّل آنے پر کامن ویلتھ فیلوشپ مل گئی اس عرصہ میں انہوں نے اپنے طور پر COMPARATIVE ایجوکیشن کا ڈپلومہ بھی کر لیا۔ اس کے بعد انہوں نے MA بھی کیا اسی دوران تنزانیہ ہائی کمیشن نے کہا کہ کامن ویلتھ انسٹیٹیوٹ کو ایک کامن ویلتھ فیلو کی ایک سال کیلئے ضرورت ہے جو انہوں نے بخوشی قبول کیا۔ پھر 1977ء میں یہ واپس تنزانیہ آ گئے ان کی تقرری بحیثیت ڈائریکٹر یونیورسٹی آف دارالسلام میں ہوئی۔ 1981ء میں ان کے وائس چانسلر نے بتایا کہ UNO کا فوڈ اینڈ ڈویلپمنٹ برائے افریقہ ادارہ کھولا ہے وہاں یہ چلے گئے اس طرح یہ "یو این او" کی ملازمت میں چلے گئے وہاں تین سال کام کیا۔ اس ادارہ نے 1985ء میں اپنے ہیڈکوارٹر روم (اٹلی) بھیج دیا۔ FAO فوڈ ایگریکلچرل آرگنائزیشن میں ایک سال بعد کامن ویلتھ فیلڈ ایکسپرٹ کی حیثیت سے انہیں طوالو بھیجا گیا۔ یہ ملک 9 جزائر پر مشتمل آزاد ملک ہے اور ملکہ برطانیہ اس کی ہیڈ ہیں۔ اور یہ بحرالکاہل پیسفک ریجن میں متعین رہے عرصہ 6 سال ان کی بڑی خدمات ہیں۔ ان کے کام کو بہت پسند کیا گیا۔ کامن ویلتھ کی رپورٹس کے مطابق ان کی یہ کارکردگی ملکہ برطانیہ کی بھی پیش کی گئی جن کے عوض ان کو ملکہ برطانیہ کی طرف سے جون 1998ء میں OBE کا اعزاز دیا گیا جس کا ذکر ملکہ نے ان سے گفتگو کے دوران کیا تھا 'سر' کی تقریب میں۔ ڈاکٹر صاحب موصوف کو بطور نمائندہ یونیسکو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی سے خطاب کرنے کا بھی موقع ملا۔ آپ نے انسانی حقوق کی مختلف تنظیموں کے تحت خدمات بھی سرانجام دی ہیں۔ اس ناطے درجنوں مختلف ممالک کے دورے بھی کئے۔ جن میں صدور، وزرائے اعظم، وزرائے خارجہ اور سفراء سے لاتعداد ملاقاتیں شامل ہیں۔ ایشیاء کے ممالک بالخصوص چین، افغانستان، بھارت، بنگلہ دیش، کوریا، ملائیشیا، انڈونیشیا میں نسلی فسادات، شدت پسندی، پناہ گزین اور مہاجرین کے مسئلے مسائل کے حل کیلئے ان کی کاوشیں گراں قدر ہیں۔ UNO ہائی کمیشن برائے مہاجرین جس کا ہیڈکوارٹر جنیوا (سوئٹزرلینڈ) میں ہے یہ اس تنظیم کا حصہ ہیں۔ اس لئے ان کو مختلف ممالک یورپ، امریکہ، کینیڈا کا دورہ کرنا پڑتا ہے۔ علاوہ ازیں مختلف دنیا کے ممالک میں یہ پیس کانفرنس میں بھی شرکت کرتے ہیں۔ عالمی سطح پر بھی یہ انسانی حقوق کے ناطے لیکچرز دیتے رہتے ہیں۔ اسی طرح یہ اپنی جماعت احمدیہ کی طرف سے بھی غیر ممالک کے دورے کرتے ہیں۔ چونکہ یہ جماعتی تنظیم انٹرنیشنل ہیومینیٹی فرسٹ کے صدر بھی ہیں۔ یہ تنظیم دنیا میں انسانوں کی فلاح و بہبود کے کاموں میں بلا رنگ و نسل خدمات انجام دیتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف اپنی ان خدمات و صلاحیتوں کے باعث بے شمار عالمی ایوارڈز یافتہ ہیں۔ ان کے اعزازات کی ایک طویل فہرست ہے۔ مزید برآں الفریڈ نوبل میڈل اعزازی ڈاکٹریٹ ان ایجوکیشن۔ ایمبیسڈر آف پیس کے اعزازات حاصل کر چکے ہیں۔ بھارت کی طرف سے ہندرتن اور نورتن کے ایوارڈ اور گولڈ میڈل بھی مل چکے ہیں۔ امریکن بائیوگرافیکل انسٹیٹیوٹ نے نہیں گریٹ مائنڈر آف اکیسویں صدی کا ایوارڈ بھی دیا گیا۔ دنیا کے مختلف اداروں کی طرف سے یہ ڈائریکٹر، ممبر اور چیئرمین ہیں جن میں چند یہ ہیں۔ طاہر فاؤنڈیشن پاکستان۔ ورلڈ میڈیا فورم انٹرنیشنل ہیومن رائٹس کمیٹی اور مسلم چینل MTA۔ ڈاکٹر صاحب کا جب مستقل طور پر لندن واپس آنے کا پروگرام بن گیا تو طوالو ملک کے پرائم منسٹر ذاتی طور پر ان کے گھر آئے اور کہا کہ آپ برطانیہ میں ہمارے ملک کے مندوب کونسل جنرل کی حیثیت میں کام کریں جو کہ آج تک یہ ان کے لئے کام کر رہے ہیں۔ عرصہ 21 سال سے یہ اس عہدہ پر فائز ہیں اور یہ کسی بھی کونسل جنرل کا برطانیہ میں طویل ترین دورانیہ ہے اور اس حیثیت سے یہ یہاں سینئر ترین ہیں۔ آخر میں ڈاکٹر صاحب موصوف نے روزنامہ یو کے ٹائمز کے سینئر صحافی محی الدین عباسی صاحب کو اخبار کے ذریعہ یہ پیغام دیا۔ خدا تعالیٰ کی اس نعمت انسانی برادری کو برابری کی بنیاد پر قائم رکھنا ہے۔ اس کیلئے کوشش کرنی ہے۔ ان کے مسئلہ مسائل کو حل کرنے کیلئے صدق دل سے کوشاں رہنا ہے۔ دنیا میں انسان کے بنیادی مسائل 70 فیصد ایک ہی ہیں۔ انسان کا ایک ہی محور ہونا چاہئے جو خدا تعالیٰ ہے۔ آج دنیا دہشت گردی کا شکار ہے ہر طرف امن کا مسئلہ درپیش ہے۔ امن کو قائم رکھنے کیلئے محبت پیار سے لوگوں کے دل جیتنے چاہئیں۔ اللہ تعالیٰ کرے ہم اس میں کامیاب ہوں۔ آمین

ملکہ برطانیہ امن کے سفیر سرافتخار احمد ایاز کو میڈل پہنا رہی ہے

چودہ اگست یومِ محاسبہ

رانا عبدالرزاق خاں

نئی نسل کو نہ سہی اہلِ وطن کا وہ حصہ جس کی آنکھوں نے دُنیا کے نقشے پر اس مملکتِ عزیز (پاکستان) کی حدود کو اُبھرتے دیکھا ہے۔اُسے تو بہر حال کچھ نہ کچھ یاد ہوگا۔اپنے رَب سے اس ارضِ پاک کی نعمت مانگتے وقت ہم نے کیا کیا عہد کئے تھے۔ کیسے کیسے نیک، نیک، تعمیری اور بلند عزائم کا اظہار کیا تھا...اور یقیناً صورت وشکل بھی اُس کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہوگی۔کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمیں اس نعمتِ عظمیٰ کا وارث بنا دیئے جانے کے بعد ہم نے اپنے وعدوں کو کس کس طرح پورا کیا اور نبھایا...اسی طرح نہ کہ لادینیت، اشتراکیت اور الحاد وزندقہ کی لعنتیں مختلف النوع خوش نما وخوش آئندہ جُتے پہن کر ہمارے فکر واحساس کی صفوں میں در آئیں۔ہم نے نعرہ لگایا تھا...کہ اس خطۂ اَرض میں ہم اپنے نظریات اور اپنی نئی نسل کی تعمیر وتربیت خالصتاً اسلامی نظریات وتعلیم کی روشنی میں کریں گے...لیکن...عملاً ہم نے اپنے ۱۹۴۷ء سے پہلے والے اسلام کو بھی خیر باد کہہ دیا اور اپنے آپ کو ہوس زَر ومال کے سپرد کر کے اپنی آئندہ نسل کی تربیت وتعمیر سراسر ناجائز، ناروا بلکہ حرام طریقوں سے حاصل کردہ یافتوں سے افرنگیت اور بے راہ وبے غیرت مغربی تہذیب کی لائنوں پر شروع کر دی۔ ہم نے بلند آواز میں اپنے عزائم کا اعلان کیا تھا کہ...ہم اس خطہ ارض موسوم بہ پاکستان کے داخلی وخارجی دشمنوں سے ہمیشہ چوکنّے اور چوکس رہیں گے قیامِ پاکستان کے دشمنوں کو کبھی منہ نہ لگائیں گے۔

اپنے ہمسایہ دشمن بھارت کے تنخواہ داروں کو کبھی گھاس نہیں ڈالیں گے۔فقط کالموں سے ہشیار رہیں گے اور اسلام کے دُشمن، منزہ، اتحاد اور انسانیت دوست تعلیم پر عمل کرتے ہوئے ہم جلد ہی ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن جائیں گے۔کہ دشمن ہمارے اندر داخل ہو کر ریشہ دوانی کرنا تو رہا ایک طرف وہ ہماری طرف میلی نگاہ سے بھی دیکھنے کی جرأت نہیں کرے گا۔لیکن اس بے نیازی، عدم تدبر اور عدم تدبر (حفظ وطن ایسے اہم فریضے سے) بے خبری کے باعث ہم نے اپنی دیکھنے والی آنکھوں سے یہاں محبت وطن سے کہیں زیادہ دشمنانِ وطن کو پھلتے پھولتے دیکھا۔اور ٹس سے مس نہ ہوئے۔فقط کالموں اور دشمنانِ وطن کے پٹھوؤں کو کیفر کردار تک پہنچانے کی بجائے سربراہانِ حکومت کی سطوتوں کو للکارتے اور سالمیتِ وطن پر تبر چلاتے دیکھا مگر ہمارے کانوں تک جوں تک نہ رینگی۔حتیٰ کہ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے بدخواہانِ وطن کینچلی بدل کر محبانِ وطن بلکہ رہنمایانِ وطن بن گئے۔اور ہم نے اُن کی اَندھا دُھند تقلید کو وظیفہ حیات بنا لیا۔ہم نے اپنے اس یقین محکم کا ڈھول پیٹا تھا کہ ہم یہاں اسلامی رواداری اور اسلامی نظام اقتصاد کی اساس پر ایک لاثانی ولا فانی معاشرے کی تعمیر کریں گے۔جس کے سائے میں انسانیت، شرافت، صداقت، دیانتی آزادی کلیلیں کیا کریں گی۔لیکن ہوس جاہ واقتدار نے ہمیں بھٹکایا کہ ہم اقتدار کی کرسیاں حاصل کرنے کے لئے حیلوں بہانوں سے اپنے ہی کلمہ گو بھائیوں کی گردنوں پر چھریاں پھیرنے لگے۔حتیٰ کہ ہمیں اس غیر اسلامی ہنگامہ رَوی میں مصروف پا کر دشمن نے ہمارے اندر فقط کالم نویس پیدا کر دیئے جو اُ مسلمانوں کی حمایت کر رہے ہیں جن کی مسلح مداخلت کے باعث پچاس ہزار پاکستانی موت کی وادی میں چلے گئے۔اور اَربوں کا اقتصادی نقصان ہو چکا ہے۔ہزاروں کی تعداد میں لاعلاج امراض میں مبتلا ہو گئے۔اپنے نہتے اور بے بس ہموطنوں کو تہ تیغ بے دریغ کرنے کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے ہیں...اور اسی قسم کی بیسیوں وعدے، وعدے اور اعلان ہم نے اپنے رَب، اور اس نئے ملک کے عوام اور اپنی آئندہ نسل سے کئے تھے...

آیئے ذرا آج ان حقائق کی روشنی میں اپنے پچھلے سالوں کے کردار کا محاسبہ کر دیکھیں کہ ہم نے اس عرصہ میں اپنے ان نظریات، عزائم، اور مواعید کا کس کس طرح رنگ نکھارا یا حُلیہ بگاڑا ہے!۔بیشک ''محاسبہ'' ایک بڑا ہی چبھتا ہوا لفظ اور کرب انگیز عمل ہے اور سہلا الحصول دولت کے حصول کی لگن میں اپنے فکر واحساس کے جسم سے اقدار اخلاق ومروت کے تمام لبادے اُتار کر باؤلی ہوئی پھرنے والی قوموں پر بڑا ہی بھاری ہوتا ہے...لیکن...یہ بھی واضح رہے کہ جو قوم آپ اپنے محاسبے سے کنی کترانا شروع کر دے اُس سے رَفتہ رَفتہ غیروں اور بدخواہوں کے احتساب کی صلاحیتیں بھی چھن جایا کرتی ہیں۔اللہ اس قوم پر رحم کرے۔

ایک شام انصر رضا صاحب کے ساتھ

(رپورٹ: رانا عبدالرزاق خان لندن)

انصر رضا صاحب کینیڈا کی ایک معروف ادبی شخصیت ہیں۔جنہوں نے شاعری کے ساتھ ساتھ اردو ادب کی دیگر کئی اصناف میں بھی قابل قدر خدمات سرانجام دیں ہیں۔کالم نگاری، مضمون نویسی، قرآن اور بائبل پر تحقیقی کام شامل ہیں۔گزشتہ دنوں ناروے میں انصر رضا کے ساتھ ایک شام مبارک شاہ صاحب نے اپنی رہائش گاہ پر منائی۔جس میں ناروے کے نامور شعراء سماجی کارکنوں اور ادب دوست شخصیت نے شرکت کی۔مقامی شعرا جمشید مسرور، آفتاب ویڑج، اندرجیت پال اور خواجہ عبدالمؤمن اوسلو نارے نے اپنے کلام سنائے اور حاضرین سے بے پناہ اد وصول کی اور آخر میں انصر رضا صاحب نے اپنا کلام سنایا جس پر حاضرین نے انہیں دل کھول کر داد دی۔

مسیحائے انسانیت کی مفارقت

ابن لطیفِ کاٹھگڑی

کہنے تو ایک شخص کی وفات ہے۔مگر اس دور کا ایک یہ عظیم شخص قرونِ اولیٰ کے ولیوں کی مانند تھا۔وہ ایک مثال تھا اُن لوگوں کے لئے جو کہتے ہیں کہ یہ دور بدل چکا ہے۔آج نیک کام یا حقوق العباد کا کام ناممکن ہے۔آج ولیوں کی طرح ،غرباء اور محتاج لوگوں کے درد کو اپنا درد سمجھ کر بانٹنا مشکل ہے ۔ عبدالستار ایدھی نے ان سب بہانہ بازوں کو شکستِ فاش دی ہے۔اور ثابت کر دکھایا ہے کہ اس دورِ بدتمیزی میں بھی خدمت خلق کی جاسکتی ہے۔اگر نیت صاف ہو تو مسلسل جدوجہد سے اسی دنیا کو جنت کا نشان بنایا جاسکتا ہے۔مگر اُن لوگوں کے لئے جو اپنی جان کو اپنی اولاد کو، اپنے مال کو ترجیح نہ دیں۔

ترجیح دیں تو اللہ تعالیٰ کی رضا کو۔رنگ ونسل اور مذہب سے بالاتر ہوکر اُسوہ رسول ﷺ کو جادہ منزل بنا کر اس نے اللہ کی رضا کو بھی اور دنیا کی بھلائی کو بھی پالیا۔وہ باعمل صوفی ،اُن جبہ پوش علمائے سُو سے افضل و برتر ہے۔جو اندرونی اور بیرونی آقاؤں کے درباری بنے بیٹھے ہیں۔اور زبان درازی میں ابلیس کے پیرو ہیں۔چاندی کی تھیلی پر نظر رکھ کر فیصلے کرتے ہیں۔قران وسنت سے بالا بالا فتاویٰ دیتے ہیں۔طالبان کو جنت کا جعلی تصور دے کر بمبار کُش تیار کرتے ہیں۔اور اللہ کے نام پر اللہ ہی کے بندوں کا خون کرواتے ہیں۔اللہ اور اس کے رسول کے نام پر حج سکینڈل،عمرہ پیکیج، کے ناجائز کاروبار میں ملوث ہیں۔ٹی وی پروگراموں میں اپنی دھونس جمانے کی خاطر عورتوں کی بے حرمتی کرنے کی دھمکی دیتے ہیں،اشرفی اور شرابی مست ہیں اور شیرانی عورتوں یا بیویوں کو مار پیٹ کرنے کا کھلے عام فتوی دیتے ہیں۔کیا ان کو عبدالستار ایدھی نظر نہیں آتے ہیں ان کو خدا اور اس کے رسول کا بھی خوف بھی نہیں۔ان درندوں کی وجہ سے ہندو، پاکستان کو چھوڑ کر بھاگ رہا ہے۔باقی بھی اقلیتوں کا اس قوم سے اعتماد اُٹھ گیا ہے۔اگر نیت صاف کی جائے۔اور ایدھی کی زندگی کو پڑھا جائے ۔اس کی ٦٦ سالہ جدوجہد نے پانچ ہزار روپے کو اربوں تک پہنچادیا۔مگر ہمارے حکومتی خزانے کہاں گئے۔ہماری اربوں روپے کی زکوۃ کیسے ہڑپ کی جاتی ہے۔عشر کیسے گول کیا جاتا ہے۔اگر ایک ہزار لوگ بھی ایدھی بن جائیں تو یہ معاشرہ جو اسلام کے نام پر تباہ کر دیا گیا ہے سُدھر سکتا ہے۔

صرف قانون کی حکمرانی کی ضرورت ہے۔یہ علمائے سُو ہرزہ سرائی کر رہے ہیں کہ اس کا جنازہ نہیں پڑھنا چاہیے تھا۔ایدھی کا سارا کاروبار غیر اسلامی تھا۔وہ زندیق تھا۔ نعوذ باللہ۔ساری قوم علمائے سُو کے ان فتاویٰ کو جوتے کی نوک پر نہیں لائی۔پاک فوج نے ، پولیس نے ، بحریہ کے دستوں نے ،فرنٹیئر کور نے سب نے سلامی دی۔اور قوم کے اس ہیرو کو تزک واحتشام سے روانہ کیا۔اور ان علمائے سُو کے فتاویٰ حسب سابق اپنا منہ ہی دیکھتے رہ گئے۔ساری قوم کو اس مسیحائے انسانیت کے طرزِ عمل کو اپنا کر اس قوم کو مایوسی سے نکالنا چاہیئے۔ساری قوم کو انسانیت کی تعریف سے آگاہ کیا جائے۔حقوق العباد کے تقاضوں سے آگاہ کیا جائے۔عبدالستار ایدھی نے جن چیلنجز کا مقابلہ کر کے درجنوں،عورتوں کے شیلٹر ہومز،فری نرسنگ ہومز،یتیم خانے،میڈیکل کلینکس،منشیات سے تباہ حال نوجوانوں کی بحالی کے مراکز،دماغی معذوروں کے لئے علاج گھر،نومولود بچوں کے لئے جھولا سروس،میتوں کی تدفین اور قبر کا انتظام مورچری سروس، اور دنیا کی سب سے بڑی ایمبولینس سروس بنائی،عبدالستار ایدھی کے چلے جانے کا نقصان صرف مسلمانوں تک محدود نہیں اس باہمت انسان نے براعظم افریقہ،مڈل ایسٹ،کاکسس ریجن،مشرقی یورپ،اور امریکہ کے ۲۰۰۵ میں طوفان میں مخلوق خدا کی مدد کی۔عبدالستار ایدھی نے نہ محل بنائے۔نہ یورپ وامریکہ جاکر عیاشی کی،نہ خوش پوشی،اور نہ ہی خوش خوراکی کو ترجیح دی۔انہیں خالص پاکستانی دیہاتی حلیئے میں بھی عالمی پذیرائی میں اتنے ایوارڈ ملے۔ان میں سے چند ایوارڈ یہ ہیں۔

رومن پبلک ایوارڈ،لینن امن ایوارڈ ،پول ہیرس فیلو،روٹری انٹرنیشنل ایواڈ، امریکن ایوارڈ،گینز بک ایوارڈز سال ۲۰۰۰،انسانی میڈیکل سروسز،انٹرنیشنل بلزان پرائز،برادر ہڈز ایوارڈ اٹلی،گاندی پیس ایوارڈز،ساؤتھ کوریا ایوارڈز،یونیسکو ایوارڈز،کالج آف فزیشن اینڈ سرجن ایوارڈز،برصغیر سوشل ورکر ایوارڈز،نشانِ امتیاز،خدمت ایوارڈز، یورپ اور انسانی حقوق ایوارڈ۔احمدیہ مسلم پیس ایوارڈ وٗ کے شامل ہیں۔اے قوم کے نابیناؤ،اے عقل کے اندھو! سوچو اور عبدالستار ایدھی بنو۔اور قوم کی خدمت کے لئے جاگ جاؤ۔ستر سال میں ہم نے کیا بنایا،عبدالستار ایدھی سے سیکھو۔علمائے سُو سے بچ کر اپنی اصلاح کرو۔میرا وطن ستر سال سے ڈاکوؤں کے گھیرے میں ہے۔اے اللہ کوئی مصطفیٰ کمال پاشا بھیج جو ان یزیدوں کی خبر لے۔ قارونوں کی شکم دری کر کے قوم کا لوٹا ہوا مال نکالے۔

حاصل مطالعہ:

☆ فوج میں ایک عام سپاہی کی بھرتی کے لئے دس کلومیٹر کی دوڑ لگانے کے ساتھ ساتھ جسمانی اور دماغی طور پر چست ہونا بھی ضروری ہے۔مگر ایک پاکستانی سیاستدان اَن پڑھ،عقل سے عاری،لاپرواہ،لنگڑا لولا ہی کیوں نہ ہو وہ وزیراعظم بن کر آرمڈ فورسز کا سربراہ بھی بن سکتا ہے۔

محمد علی کلے - قیصر محمود

باکسنگ کی دنیا کے عظیم کھلاڑی محمد علی انتقال کر گئے۔اس عالمی چیمپین کو 20 صدی کا بہترین ایتھلیٹ قرار دیا جاتا ہے۔نہ صرف ایک عظیم باکسر بلکہ یں صدی کے عظیم کھلاڑی اورسب سے بڑھ کر ایک اچھے انسان محمد علی 3 جون 2016ء کو انتقال کر گئے۔محمد علی نے اپنی زندگی میں 61 مقابلے لڑے 56 مقابلوں میں کامیابی اورصرف پانچ میں ناکامی ہوئی۔37 مرتبہ انہوں نے اپنے مخالفین کو ناک آؤٹ کیا۔محمد علی 17 جنوری 1942 کو امریکہ کے شہر لوئس ویل (Louisville) میں پیدا ہوئے۔محمد علی کے والدین نے ان کا نام اپنے علاقے کے مشہور شخص کے نام پر کیسیوس مارسیلز کلے (Cassius Marcellus Clsy) رکھا۔محمد علی کا تعلق ایک غریب سیاہ فام گھرانے سے تھا۔لیکن اسے بچپن سے ہی باکسنگ کا شوق تھا۔

کیریئر کا آغاز

شوقیہ باکسنگ کا آغاز کرنے والے محمد علی کی شہرت کا آغاز 1960ء میں روم (اٹلی) میں ہونے والے اولمپکس میں سونے کا تمغہ حاصل کر کے ہوا۔اولمپکس میں تمغہ جیتنے کے بعد وہ اپنے ایک دوست کے ساتھ ایک ریستوران میں گئے جہاں انہیں ریستوران میں داخل ہونے سے منع کر دیا گیا اور بتایا گیا کہ یہاں صرف سفید فام ہی داخل ہو سکتے ہیں۔محمد علی نے اس ناروا سلوک پر دلبرداشتہ ہو کر اپنا اولمپکس میں جیتا ہوا سونے کا تمغہ دریائے اوہائیو میں پھینک دیا۔تاہم انہوں نے باکسنگ میں نام ہی بنانے کیلئے محنت جاری رکھی۔ 1960 ہی میں انہوں نے باقاعدہ طور پر پروفیشنل باکسر کے طور پر اپنے کیریئر کا آغاز کیا۔

عالمی ٹائٹل کا حصول فتوحات

1964ء میں جب محمد علی 19 فتوحات حاصل کر چکے تھے۔تو انہوں نے صرف 22 سال کی عمر میں ہیوی ویٹ چیمپین سونی لسٹن (Sonny Liston) کو چیلنج دیا۔اس مقابلہ سے قبل وہ ایک کمزور حریف تصور ہو رہے تھے لیکن انہوں نے اپنی شاندار مکے بازی سے سونی لسٹن کو اتنا نڈھال کر دیا کہ اس نے مقابلہ کے ساتویں راؤنڈ میں اکھاڑے میں آنے سے انکار کر دیا۔اس طرح محمد علی نے پہلی بار ''ورلڈ ہیوی ویٹ چیمپین'' بننے کا اعزاز حاصل کیا۔

پابندیاں

1964 ء میں محمد علی نے ''نیشن آف اسلام'' تنظیم میں شمولیت اختیار کر لی اور اپنا نام کیسیوس کلے سے بدل کر محمد علی رکھ لیا۔محمد علی نے اپنے اعزاز کا کامیابی سے دفاع کیا ان کی کامیابیوں کا سفر 1967ء تک جاری رہا۔1967ء میں ویت نام کے ساتھ جنگ میں امریکن فوج میں شمولیت سے انکار پر محمد علی سے ٹائٹل چھین لیا گیا اور اُن پر باکسنگ کھیلنے کی پابندی لگا دی گئی۔اس دوران انہوں نے اپنی پابندی کے خلاف عدالت سے بھی رجوع کیا۔1970 ء میں محمد علی پر سے یہ پابندی اُٹھا لی گئی کیا۔8 مارچ 1971ء کو انہوں نے ورلڈ چیمپین جوفریزیر کے ساتھ مقابلہ کیا۔اس مقابلہ پر تمام لوگوں کی نظریں اُن پر تھیں اور اس کا مقابلہ کو The FIGHT of the century کا نام دیا گیا۔15 راؤنڈ پر مشتمل اس مقابلہ میں محمد علی نام کو باوجود بہترین کھیل کے شکست ہو گئی۔

عروج کا دوبارہ حصول

جنوری 1974ء میں محمد علی نے جوفریزیر کے ساتھ پھر مقابلہ کیا جو اپنا اعزاز کھو چکا۔ محمد علی نے جیو فریزیر کو ہرا کر ہیوی ویٹ ٹائٹل کیلئے فورمین (Foreman) کو چیلنج دے دیا۔(8 اکتوبر 1974ء کو کانگو (زائرے) میں کھیلی جانیوالی اس کا فائٹ کو The Rumble in the jungle نام دیا گیا۔محمد علی نے اپنے شاندار کھیل سے فورمین کو شکست دیکر دوسری مرتبہ ورلڈ ہیوی ویٹ چیمپین ہونے کا اعزاز حاصل کر لیا۔19 فروری 1978ء کو محمد علی کو لیون سپنکس کے ہاتھوں شکست ہو گئی۔لیکن ستمبر 1978ء میں محمد علی ہیوی ویٹ چیمپین سپکنس کو ہرا کر تیسری بار ورلڈ ہیوی ویٹ چیمپین بن گئے۔

ریٹائرمنٹ

27 جون 1979ء کو محمد علی نے باکسنگ سے ریٹائرمنٹ کا اعلان کر دیا۔اس وقت محمد علی کو 59 کھیلے جانے والے مقابلہ جات میں صرف تین بار اسے اپنے مخالف سے شکست ہوئی تھی اور 37 بار اس نے اپنے مخالف کو ناک آؤٹ کیا۔لیکن ورلڈ باکسنگ کونسل (WBC) کے اصرار پر محمد علی نے 1980ء میں ہیوی ویٹ چیمپین لیری ہومز کے ساتھ مقابلہ کیا لیکن شکست کھا گئے اسی طرح ایک اور میچ میں ٹریور برنک کے خلاف بھی انہیں شکست کا سامنا کرنا پڑا۔

1981ء میں محمد علی نے باقاعدہ طور پر باکسنگ سے ریٹائرمنٹ کا اعلان کر دیا۔ انہوں نے اپنے کیریئر میں اپنے بہترین کھیل کے ساتھ ساتھ اپنی عمدہ تقریری صلاحیت کے باعث بھی اپنے مخالفین پر نفسیاتی دباؤ رکھا۔وہ اپنے متعلق ہمیشہ کہا کر

تے تھے کہ I am the greatest یاد رہے کہ جب وہ بیماری میں مبتلا ہوئے تو وہ یہی کہا کرتے کہ خدا تعالیٰ نے انہیں اس بیماری میں مبتلا کر کے بتایا کہ تم عظیم نہیں بلکہ عظیم میں ہوں۔محمد علی کا یہ مقولہ بھی بہت مشہور ہے کہ

I could float like a butterfly, and sting like a bee

(ترجمہ: میں تتلی کی طرح اڑ سکتا اور شہد کی مکھی طرح کاٹ سکتا ہوں۔)

اعزازات

اپنے بہترین فٹ ورک اور مکے بازی سے محمد علی پہلے باکسر بن گئے۔جنہوں نے تین بار ورلڈ ہیوی ویٹ چیمپین بننے کا اعزاز حاصل کیا۔1996ء کے اٹلانٹا اولمپکس میں محمد علی نے مشعل کو روشن کر کے اولمپکس کا باقاعدہ افتتاح کیا۔انہی اولمپکس مقاں میں محمد علی کو ایک اعزازی گولڈ میڈل دیا گیا جو اس میڈل کے متبادل کے طور پر تھا جو وہ دریائے اوہائیو میں پھینک چکے تھے۔اس طرح محمد علی کو اولمپکس ہال آف فیم اور ورلڈ باکسنگ ہال آف فیم میں شمولیت کا اعزاز بھی وحاصل ہوا۔لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ حاصل کرنے والے محمد علی 20 ویں صدی کے آخر پر بے شمار لکھنے والوں نے 20 صدی کا بہترین ایتھلیٹ قرار دیا جب کہ کئی درجہ بندی کرنے والوں نے ایتھلیٹ آف دی میلینیم قرار دیا۔محمد علی کی ایک بیٹی لیلیٰ علی خود بھی ایک بہترین باکسر ہے اور کئی مقابلے جیت چکی ہے۔محمد علی ایک عرصہ پارکنسن (رعشہ) کی بیماری میں مبتلاء تھے لیکن تادم آخر وہ انسانیت کی خدمت کے لئے چیرٹی کے کاموں میں حصہ لیتے رہے۔ ان کی سوانح عمری MY Own stroy کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔محمد علی کی تدفین 10 جون کو ان کے آبائی قصبہ میں ہوئی۔

موثر ترین شخصیت

مشہور عالم کتاب The Hunderd کا مصنف مائیکل ہارٹ رسول کریم ﷺ کے دنیا میں موثر ترین انسان ہونے کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتا ہے۔آپ ﷺ ہی تاریخ انسانی کی ایسی منفرد شخصیت ہیں جو دینی و دنیاوی دونوں اعتبار سے انتہائی کامیاب ثابت ہوئے۔آپ نے ایک کمزور حیثیت سے زندگی کا آغاز کرتے ہوئے دنیا کے بڑے بڑے مذاہب میں سے ایک مذہب کی بنیاد رکھی اور اسے زندگیوں میں نافذ کیا اور ایک انتہائی موثر کن رہنما بن کر اُبھرے۔آج ان کی وفات کے تیرہ صدیاں بعد بھی آپ کا اثر غیر معمولی طاقت اور نفوذ رکھتا ہے۔

(A Ranking of most influential of history 1987 NY)

مجھے خوبصورت خواتین پسند ہیں

محی الدین عباسی لندن
MBA۔سینیئر صحافی۔تجزیہ کار

کراچی 24 مئی 2016 دنیا پاکستان کی ایک خبر کے حوالے سے اور اس پر تبصرہ

رویت ہلال کمیٹی کے رکن اور مذہبی سکالر مفتی عبدالقوی نے انکشاف کیا ہے کہ وہ ایئر پورٹ پر خوبصورت خواتین کو تلاش کرتے ہیں جس کے بعد اسی قطار میں لگ جاتے ہیں جہاں استقبالیہ پر خوبصورت محترمہ ہو۔حدیث نبوی ﷺ ہے کہ خوبصورت چہرہ دیکھو تو اس سے کہو کہ میرے لئے دعا کر کیونکہ اللہ خوبصورت بھی ہے اور خوبصورتی کو پسند بھی کرتا ہے۔جہاز میں ایئر ہوسٹس جو سب سے زیادہ خوبصورت ہوتی ہے اسے دیکھتا ہوں۔ایک مرتبہ میں چاند دیکھنے کے لئے گیا اور اعلان کر دیا کہ اگلے روز عید ہوگی۔مجھے ہر حال میں ملتان پہنچنا تھا چونکہ مجھے نماز عید پڑھانی تھی۔ایئر پورٹ پر وٹو کال افسر سے کہا کہ مجھے ہر حال میں ملتان جانا ہے۔ انہوں نے کہا کہ محترم 36 لوگ پہلے سے بک ہو چکے ہیں۔ممکن نہیں میں نے PIA کی محترمہ سے کہا کہ آپ کا چہرہ بہت خوبصورت دکھائی دے رہا ہے۔میرا دل کہتا ہے آپ میرا کام کر دیں گی۔پوچھا کیا کام ہے۔بتاتے ہی خاتون بولی کہ جہاں 36 ہیں وہاں 37 لوگ بھی ہو سکتے ہیں۔لہٰذا یہ بورڈنگ کارڈ لیجئے ہم سنبھال لیں گے ۔قارئین چند واقعات موصوف سے متعلق اور فتووں کے بارے میں جو الیکٹرونک اور پرنٹس میڈیا پر بیان ہو چکے ہیں۔ذکر کرتا ہوں۔ماڈل گرل قندیل بلوچ آپ کہاں رہتی ہیں میں آپ کو پسند کرتا ہوں اور ملنا چاہتا ہوں۔اس خواہش کا اظہار مولٰنا نے ایک نجی چینل پر لائیو شو پر کیا اور انہوں نے یہ فتویٰ بھی دے ڈالا کہ گرل فرینڈ سے جنسی تعلقات رکھنا حلال ہیں۔تفصیلات کے مطابق اپنی ایک ویڈیو میں مفتی عبدالقوی کا کہنا ہے کہ بحیثیت طالب علم قرآن وسنت سے جو کچھ میں نے سمجھا ہے وہ یہ ہے کہ آج 21 ویں صدی کے اندر جب ہم نے بدکرداری اور بداخلاقی کا دروازہ بند کرنا ہے تو قرآن وسنت کا خلاصہ یہ ہے کہ شادی ایک ہوگی اور نکاح متعدد ہونگے۔انہوں نے کہا کہ جو کسی کی منکوحہ نہ ہو اور آپ کی محرم (یعنی پھوپھو، خالہ) نہ ہو اس سے آپ جو نکاح کریں گے، جو معاہدہ کریں گے وہ شرعی طور پر نکاح ہوگا اور حلال ہوگا انکی ویڈیو یو ٹیوب پر دستیاب ہے انکا کہنا ہے کہ شادی صرف ایک کریں نکاح جتنے مرضی چاہیں کریں۔ہر لڑکی آپ کے لئے حلال ہے۔ ان کے اس نئے فتنہ نے ملک میں ایک علیحدہ بحث چھیڑ دی ہے اور دھوم مچا دی ہے۔علاوہ ازیں یہ مفتی صاحب ایک نجی چینل پر مشہور راولپنڈی کے خواجہ سرا الماس بابی کیساتھ فلرٹ کرتے ہوئے بھی پائے گئے ان سے شادی کے لئے بھی رضا

مند ہو گئے ۔ یہ تماشہ بھی ساری دنیا نے ٹی وی پر دیکھا۔علاوہ ازیں اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ مومن مردوں سے کہہ دو کہ اپنی نظریں نیچی رکھا کریں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کیا کریں۔ یہ ان کے لئے بڑی پاکیزگی کی بات ہے۔

ذہن پاک ہو خیالات نیک ہو تو خدا تعالیٰ کی ہر شہ خوبصورت لگنے لگتی ہے۔ پھر ان تصوراتی خیالات میں انسان کو خدا تعالیٰ اور انبیأ کرام، ولیوں اور نیک لوگوں کا خواب میں دیدار نصیب ہوتا ہے۔یہی ایک مسلمان کی حقیقی خوشی۔تسکین اور خوبصورتی ہے۔ باقی باتیں بیہودہ فضول اور گمراہ کن ہیں جو خدا تعالیٰ سے دور کر دیتی ہیں۔ ہماری قوم ایسے ملاؤں کے بیہودہ عقائد اور خودساختہ قصہ کہانیوں میں رہ رہی ہے۔ محمد ﷺ نے آخری زمانے کے علماء کو علماء سوء اور بدترین مخلوق فرمایا ہے۔ آج کوئی بھی قوم سے

پوچھے یہ بات جو قرآن وسنت کے خلاف ہے تو کیوں کر رہے ہو؟ جواب دیتے ہیں ہمیں ملاؤں نے کہا ہے۔حضرت محمد ﷺ کی تعلیم پر عمل نہ کرنے سے قوم آج تباہ حال ہو چکی ہے۔اس قسم کے واقعات کی وجہ کم علمی کا فقدان اور ہمارا کلچر مائینڈ سیٹ ہے ہمارے دینی مدرسوں میں جو تعلیم دی جاتی ہے۔جس سے فرقہ پرستی۔انتہا پسندی وتنگ نظری اور زہریلے نظریات جنم لیتے ہیں چونکہ ہر فرقہ اپنی اپنی تعلیمات کا درس دیتا ہے اور حسب منشاء تاویل نکالتا ہے جس سے ملک میں ہر طرف ایسے واقعات رونما ہو رہے ہیں۔ ایسے ہی حالات کا ذکر ملک کے مشہور شاعر، فلاسفر حکیم الامت ڈاکٹر علامہ محمد اقبال نے کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں ”تاریخ اسلام میں سب سے زیادہ مظلوم قرآن ہے۔ ایسے لوگ مسلمانوں میں ہمیشہ موجود رہے ہیں جن کے لئے اپنے اغراض ومقاصد اور اپنے خودساختہ عقائد مقدم ہوتے ہیں۔ وہ اپنے ثبوت اور استحکام کے لئے قرآن کی آیات تلاش کرتے ہیں اور اپنی ابلیسیانہ زیدکی سے ان کی حسب منشاء تاویل کرتے ہیں اور یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے“

(حوالہ تشبیہات رومی جلد اول صفحہ ۱۶۰ از ڈاکٹر خلیفہ عبدالحلیم ادارہ ثقافت اسلامیہ پاکستان)

علامہ اقبال نے ملائیت کے ہولناک فتنہ کو بے نقاب کیا ہے۔ مثلاً وہ فرماتے ہیں:۔

قرآن کو بازیچہ تاویل بنا کر
چاہے تو خود اک تازہ شریعت کرے ایجاد

علامہ اقبال رقم طراز ہیں کہ ہمارے مولوی جس کام میں مصروف ہیں یہ وہی کام ہے جو ابلیس نے اپنی مجلس شوریٰ میں اپنے ہم کاروں کے سپرد کیا تھا۔اور ملا شیطان کی مجلس شوریٰ کے فیصلوں پر عمل کر رہا ہے۔(حوالہ اقبال اور ملا صفحہ ۱۲ از ڈاکٹر خلیفہ عبدالعلیم)ہمیشہ شیطان کے حملوں نفس کو بچانے کے لئے انتہائی کوشش کرنی چاہیے۔ خدا تعالیٰ کو بھلا دیا جائے تو ایسے خیالات جنم لیتے ہیں اور جب شیطان انسان کے اوپر غالب آجائے تو ایسا ہوتا ہے۔رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ شیطان انسان کے خون کیساتھ اس کے جسم میں چلتا ہے اور دوسری حدیث میں فرمایا کہ میرا شیطان مسلمان ہو گیا ہے۔ (صحیح بخاری حدیث ۲۰۳۸ / اور دوسری حدیث مسلم ۷۱۰۸)

آجکل کے زمانے اور معاشرے میں جو خطرناک چیز ہے وہ روحانی بیماریاں ہیں اور یہ بیماری ہمارے معاشرہ میں عام ہے اور پھیلتی جا رہی ہے۔اس کا تعلق مندرجہ بالا بیان کردہ حدیث سے ہے انسان کو پتہ نہیں لگتا کہ کس وقت شیطان ہمارے خون میں چلا گیا۔جسمانی بیماری کی نسبت یہ روحانی بیماری زیادہ خطرناک ہے۔پس ایک مومن کو اس سے پہلے کہ یہ بیماری لاحق ہوا اپنا خود جائزہ لینا چاہیے۔اس میں حفظ ماتقدم کی ضرورت ہے اور یہی ایک حقیقی مومن کے لئے ضروری ہے اور اس کو چاہیے کہ وہ اس کے لئے ہمیشہ کوشش کرتا رہے۔مومن کی اصل معراج تقویٰ ہی ہے۔ جو تمام برائیوں کو دور کرتا اور روحانی علاج کا باعث ہے۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ مومن کبھی اللہ تعالیٰ کی خشیت اور خوف سے خالی نہیں ہوتا اور نہ ہونا چاہیے آنحضرت ﷺ راتوں کو اٹھ اٹھ کر خدا کے حضور نہایت عجز وانکساری سے دعائیں کرتے تھے۔ حضرت عائشہؓ نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا کہ آپؐ اتنی دعائیں کیوں مانگتے ہیں جبکہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو بخش دیا ہے آپ ﷺ نے جواب دیا کیا میں خدا تعالیٰ کا شکر گزار بندہ نہ بنوں۔ پس ہم سب کو ایسے مولوی حضرات سے بچنا چاہیے جس سے ہمارا دین جا تا رہے اور اپنے ہر عمل کو خدا تعالیٰ کے حکموں قرآن وسنت کی حقیقی تعلیمات کے مطابق خود کوشش کرنی چاہیے۔ ان بیہودہ خیالات کی بجائے روحانی خیالات پر نظر رکھیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

تیسری عالمگیر جنگ :: کیا خطرہ روز بروز بڑھ رہا ہے

زبیر خلیل خان

اُردشیر دوم

گذشتہ سات دہائیوں کے بعد موجودہ صدر امریکہ کو آخر خیال آ ہی گیا اور دوسری عالمگیر جنگ کے 71 سال بعد وہ جاپان کے شہر ہیروشیما گئے اور دوسری عالمگیر جنگ کے دوران امریکہ نے اس شہر پر جو ایٹم بم برسائے تھے اور اس کے نتیجہ میں جو تباہی پھیلی تھی اسکا از خود مشاہدہ کرے اور اس امر کا جائزہ بھی لے کہ آئندہ دنیا کو ایٹمی تباہی سے کیسے بچایا جا سکتا ہے۔ وہ ایٹم بم جو ہیروشیما شہر پر برسائے گئے تھے اگر انکا موجودہ دور کے ایٹم بموں سے مقابلہ کیا جائے تو اگر برسائے گئے ایٹم بم شہر نیست و نابود کرنے کی طاقت رکھتے تھے تو موجودہ ایٹم بم یقینی طور پر ایک پوری انسانی تہذیب وتمدن کو نیست و نابود کرنے کی طاقت رکھتے ہیں۔مشہور سائنسدان آئن سٹائن نے ایک مرتبہ تبصرہ کرتے ہوے کہا تھا کہ اُسے یہ تو علم نہیں کہ تیسری عالمگیر

جنگ کس طرز پر لڑی جائے گی لیکن اتنا ضرور علم ہے کہ چوتھی عالمگیر جنگ پتھر کے دور کی طرز کی یاد تازہ کردے گی۔ اس کے اس تبصرہ سے صاف ظاہر ہے کہ تیسری عالمگیر جنگ جو لازماً ایٹمی جنگ ہوگی بنی نوع انسان کو کس ہولناک تباہی سے دوچار کرے گی کہ دنیا پتھر کے دور میں واپس چلی جائے گی۔

دوسری عالمی جنگ کے بعد سے ہی دنیا کی بڑی طاقتیں اس سعی میں ہیں کہ ایٹمی ہتھیاروں کو قابو میں رکھا جاسکے۔اس وقت نو ممالک کے پاس ایٹمی ہتھیاروں کا ذخیرہ ہے۔اور دنیا میں دہشت گردی کی لہر کے پیش نظر یہ خطرہ ہر وقت سر پر منڈلاتا رہتا ہے کہ کہیں یہ مہلک ہتھیار دہشت گردوں کے ہاتھ نہ لگ جائیں۔ عالمی ایٹمی ماہر Mr Waren Buffet کے مطابق ہر آنے والے ایک سال میں کسی غلطی یا اور کسی وجہ سے ایٹمی ہتھیاروں کے استعمال کئے جانے کا 10٪ رسک ہے۔ اور اگر یہ رسک آئندہ پچاس سالوں میں اسی طرح رہتا ہے تو یاد رکھ لیں کہ آنے والے پچاس سالوں میں کسی حادثہ یا غلط وارننگ کی بنا پر ایٹمی ہتھیاروں کے probable استعمال کا 5.99٪ چانس بن رہا ہے۔

تازہ ترین اطلاعات کے مطابق امریکہ اور روس نے اپنے ایٹمی ہتھیاروں کو مختلف جگہوں پر نصب کر رکھا ہے جو کسی بھی حادثہ یا غلط وارننگ کی بنا پر ایک لمحہ کے نوٹس پر فائر کئے جاسکتے ہیں۔اور دنیا بھر میں لامتناہی تباہی پھیلا سکتے ہیں۔ چند دہائیاں قبل امریکہ اور روس میں ایٹمی ہتھیاروں کے استعمال کے بارہ میں تسلسل سے روابط اور مذاکرات کئے جاتے تھے جو کہ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ ختم ہو چکے ہیں۔ اور اس وقت دونوں ممالک میں شدید تناؤ کی صورتحال ہے۔ جو کسی بھی ایٹمی حادثہ کا باعث بن سکتی ہے۔ایک جائزہ کے مطابق اس وقت دنیا کے 24 ممالک میں Plutonium Highly enriched Uranium کی بہت بڑی مقدار موجود ہے جو کہ کئی ہزار ایٹم بم بنانے کے لیے کافی ہے۔اور اس وقت عالمی سطح پر کوئی ایسا موثر نظام موجود نہیں ہے کہ اتنی بڑی تعداد میں موجود اس خوفناک مواد کے استعمال پر کڑی نظر رکھی جاسکے۔اسی طرح ایٹمی ہتھیاروں کے حامل موجود ممالک کے علاوہ کئی دوسرے ممالک بھی ایٹمی ہتھیاروں کے حصول کی دوڑ میں شامل ہونے کے لیے کاوشیں جاری رکھے ہوئے ہیں۔ایٹمی ہتھیاروں کے حصول کی آرزو ایک انتہائی خطرناک خواہش ہے جو دنیا کو دن بدن تباہی کے دہانے کی طرف لے جارہی ہے۔ ایران کو ایٹمی ہتھیاروں کے حصول سے روکنے کی کاوش کو حوصلہ افزا کاوش کہا جاسکتا ہے۔اور اُمید کی جاسکتی ہے کہ معاہدہ کے تمام اسٹیک ہولڈرز اس کو کامیاب بنائینگے۔ ایٹمی ہتھیاروں سے لیس شمالی کوریا ایک ایسا ملک ہے جس کے بارہ میں دنیا بھر میں شکوک اور شبہات پائے جاتے ہیں۔اس ملک کے ساتھ چین جاپان اور جنوبی کوریا کے کسی نہ کسی حد تک ورکنگ تعلقات ہیں لہٰذا ان ممالک کو کوشش کر کے شمالی کوریا کو بھی مذاکرات کی ٹیبل پر لانا چاہیئے تاکہ دنیا کو درپیش ایٹمی جنگ کے خطرات کو کم کیا جاسکے۔امریکہ اور روس کے کشیدہ حالات اس وقت سب سے زیادہ خطرہ کی علامت بنے ہوے ہیں۔اور کسی وقت بھی دنیا کو تیسری عالمی جنگ میں دھکیل سکتے ہیں۔ دنیا کے ایٹمی ہتھیاروں کا 90 فیصد ذخیرہ ان دونوں ممالک کے کنٹرول میں ہے۔ Strategic Interest کسی غلط فہمی۔غلط وارننگ یا کسی اور وجہ سے اگر ان دو ممالک میں سے کسی ایک نے غلطی کردی تو دنیا کا بیشتر حصہ چند لمحوں کے اندر اندر پتھر کے زمانہ میں واپس چلا جائے گا۔اب اس وقت کے حکمران جو ان خطرناک ہتھیاروں کے ذخیرہ کو کنٹرول کر رہے ہیں ان کا یہ فرض بنتا ہے کہ وہ مل بیٹھ کر دیانت داری سے بات چیت کریں تاکہ دنیا پر تیسری عالمی ایٹمی جنگ کے منڈلاتے ان خطرات کو ٹالا جاسکے۔ بصورت دیگر اگر یہ تیسری عالمی ایٹمی جنگ ایک دفعہ شروع ہوگئی تو پھر شائد کوئی کوئی ہی بچے گا جو یہ کہتا سنا جائے گا کہ کاش اس جنگ کو بروقت روک لیا جاتا۔

اُردشیر ایران کے مشہور چار بادشاہوں کا لقب

ابن لطیف (Arataxerxes)

اُردشیر اوّل

اس نے 465 ق م سے 425 تک حکومتکی۔ یہ یہیمن کا چھوٹا بیٹا تھا جو اپنے باپ اور بڑے بھائی دارا کے قتل کے بعد ایران کے تخت پر بیٹھا۔ یہ درازدست بھی کہلاتا تھا کیونکہ اس کا دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ سے کافی بڑا تھا۔ابتدا میں ارتابنس (Artabuns) کے زیر اثر رہا۔جب ارتابنس اردشیر کو قتل کرنے کی سازش میں مارا گیا تو ایک اور امیر باگ تکھشا نامی کے زیر اثر آیا۔اس کے عہد میں بغاوتیں ہوتی رہیں۔مشہور یونانی جرنیل (Themisteeles) عمر کے آخری ایام میں اس سے آملا اور بقیہ عمر اسی کے دربار میں گزاری۔اُردشیر دوم۔دور حکومت 404 ق م دارا ثانی کا بیٹا جو دارائے دانشمند کے لقب سے ہ خامنشی تخت پر بیٹھا۔اپنے بھائی سائرس کو جو تخت کا دعویدار اور ایشیائے کوچک کا گورنر تھا شکست دی۔387 ق م میں یونان کی اہم فوجی طاقت سپارٹا کو شکست دے کر ذلت آمیز شرائط ماننے پر مجبور کردیا۔ مصر اور بابل کی بغاوتیں فروکیں۔ ایران کے قدیم دیوتا مھرا (سورج) کی پرستش کو دوبارہ رواج دیا۔ مردم خیزی کی دیوی ''انابیتا'' کے بت جگہ جگہ نصب کئے اور اوران دونوں دیوتاؤں کو ''اہورمزدا'' (پارسیوں کا خدا) کے ہم رتبہ قرار دیا۔

اُردشیر سوم

حکومت 358 ق م تا 338 ق م۔ یہ اردشیر دوم کا بیٹا تھا جس کی ماں یونانی تھی۔اپنی

سوتیلی ماں اتوسا سے مل کر اپنے دونوں بڑے بھائیوں ''دارا'' اور ''اریاسب'' کو باپ کے عہد ہی میں قتل کرادیا۔ تخت نشین ہوکر باقی ماندہ شہزادوں اور شہزادیوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ اسیدون اور مصر کی بغاوت کو بڑی سفاکی سے کچلا اور بکثرت لوگوں کو قتل کیا۔ مصری شہروں اور مندروں کو تباہ و برباد کرکے ایران واپس آیا۔ یہ بات اس کے ایک خواجہ سرا بگواس (Bagos) کو ناگوار گزری اور اردشیر کو زہر دیکر ہلاک کردیا۔ اس نے بادشاہ کے سب بیٹوں کو بھی ہلاک کردیا اور بخامنشی خاندان کے ایک رکن کڈومینس کو دارا سوم کے لقب سے تخت پر بٹھادیا۔

اُردشیر چہارم

دور حکومت 211ء تا 241ء۔ اس کے تخت نشین ہونے سے خاندان ساسان کی حکومت کا آغاز ہوا۔ اس نے قدیم ماگی مذہب کو پھر رائج کیا۔ مملکت کے قوانین کی اصلاح کی اور تعلیم کو فروغ دیا۔ یہ پاپک (Papak) کا بیٹا تھا اور ابتداء میں فارس کے حکمران ارتابنس (Artabuns) کا باجگزار تھا۔ 226.27 میں اس نے ارسیسد خاندان کے آخری فرمانروا کے خلاف علم بغاوت بلند کرکے اسے ہرمز کے مقام پر شکست دیکر ہلاک کر دیا اور خود فارس کے تخت پر بیٹھ گیا۔ اس نے مرو، بلخ اور خوارزم کو فتح کیا۔ اس نے ہندوستان پر حملہ کرکے پنجاب سے بھی خراج وصول کیا۔

حاصل مطالعہ — عاصی صحرائی

☆ یہ مسجد مندر بھی عجیب جگہ ہے۔ جہاں غریب باہر اور امیر اندر بھیک مانگ رہا ہے۔

☆ پڑوسی! کے بچوں کی بھوک اور فاقہ سے انجان رہنا اور اس کی بیوی اور بیٹی کے حرکتوں سے واقف رہنا ہمارے معاشرے کا بہترین مشغلہ ہے...!!

☆ مستری اسحاق ڈار کو ماہرِ معاشیات قرار دینا ایسا ہی ہے جیسے گاؤں میں نائی سے بچوں کے ختنے کروا کر اُسے سرجن کہنا شروع کردیا جائے۔

☆ ایک پاکستانی سیاستدان دو یا دو سے زائد حلقوں میں بیک وقت الیکشن لڑسکتا ہے۔ مگر ایک پاکستانی شہری دو حلقوں میں ووٹ نہیں ڈال سکتا۔

☆ ایک شخص جو جیل میں ہے ووٹ نہیں دے سکتا مگر ایک پاکستانی سیاستدان جیل میں ہونے کے باوجود بھی الیکشن لڑسکتا ہے۔

☆ ایک شخص جو کبھی جیل گیا ہو کبھی سرکاری ملازمت حاصل نہیں کرسکتا مگر یک پاکستانی سیاستدان کتنی بار بھی جیل گیا ہو وہ صدر، وزیراعظم، ایم پی اے، ایم این اے، یا کوئی بھی عہدہ حاصل کرسکتا ہے۔

☆ کسی بھی بینک میں معمولی ملازمت کے لئے آپ کا گریجوایٹ ہونا ضروری ہے لیکن ایک پاکستانی سیاستدان کوئی بھی منسٹر بن سکتا ہے چاہے وہ انگوٹھا چھاپ ہی کیوں نہ ہو۔

دنیا کا پہلا فلسفی۔ تھیلیز آمائیلیٹس

(Thales of Miletus)

عاصی صحرائی

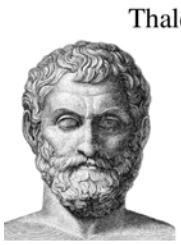

بھری گرمیوں کا دن تھا، دو متحارب بادشاہوں کی فوجیں آپس میں برسرِ پیکار تھیں، اس دن سینکڑوں لاشیں گرچکیں تھیں۔ یہ دونوں فوجیں پچھلے پندرہ سالوں سے آپس میں خون کی ندیاں بہا رہی تھیں کبھی جن رُک جاتی تھی اور کبھی خون آشام تلواریں ہزاروں جوانوں کو موت کی ابدی نیند سلا دیتی تھیں۔ اور پچھلے پانچ سالوں سے تو بغیر کسی وقفے سے جنگ اور موت کے دیوتا ہی ان کی پرستشوں کے محور تھے۔ کہ یکا یک آسمان نے اپنا رنگ بدلنا شروع کیا۔ ایک عفریت تھی کہ سورج دیوتا کو نگلے جارہی تھی۔ روزِ روشن، آہستہ آہستہ تاریکی میں بدلنا شروع ہوا، دیکھتے ہی دیکھتے وہ عفریت مکمل طور پر سورج دیوتا کو نگل گئی، لوگوں کو دن دیہاڑے ستارے نظر آنے لگے اور بھری دوپہر میں یوں محسوس ہونے لگا کہ آدھی رات ہے۔ ان متحارب لشکروں نے اپنے سورج دیوتا کا یہ حشر ہوتے دیکھا تو تلواریں، نیزے، بھالے پھینک کر، سجدے میں گر گئے اور مناجات پڑھنے لگے۔ سورج دیوتا کو آہستہ، آہستہ اس عفریت سے رہائی ملی اور وہ دوبارہ اپنی کرنوں سے دنیا کو ضیاء پاش کرنے لگا۔ لیکن اب دونوں لشکروں کے دل بدل چکے تھے، انہوں نے لڑنے سے انکار کردیا، انہوں نے کہا کہ دیوتا ان کی خونریزیوں کی وجہ سے ان سے ناراض ہوگئے تھے، اسی وجہ سے سورج دیوتا کو یہ سزا ملی، لہذا یہ موت کا کھیل بند کرکے امن سے رہنا چاہیئے۔ جب پیادے ہی لڑنے کو تیار نہ تھے تو شاہ و وزیر بھلا کیا کرتے سو ان دونوں بادشاہوں نے آپس میں امن کا معاہدہ کیا اور عوام ہنسی خوشی رہنے لگے۔

یہ کوئی دیومالائی کہانی نہیں ہے بلکہ قدیم تاریخ کا ایک ایسا منفرد واقعہ ہے جس کا انتہائی صداقت سے تعین ہوچکا ہے۔ یہ ہمارے مروجہ اور مستعمل کیلنڈر کے مطابق 28 مئی 585 قبل مسیح کا دن تھا کہ جس دن سورج گرہن لگا، اور یہ دونوں فوجیں قدیم سلطنتوں لیڈیا اور میڈیا کی تھیں، موجودہ دور میں یہ دونوں علاقے، بالترتیب ترکی اور ایران کے حصے بنتے ہیں کہ جو ازمنہ قدیم سے ہی آپس میں برسرِ پیکار رہے ہیں۔ یہ تو شاید مظاہر فطرت کا پہلا واقعہ تھا جسنے ان لوگوں کی پرخون دنیا میں امن پیدا کردیا۔ لیکن اس واقعے کی اہمیت ایک اور وجہ سے اس بھی زیادہ اہم ہے۔ جس وقت یہ جنگ سورج گرہن کی وجہ سے رکی، اسی وقت لوگوں نے میدانِ جنگ سے ملحقہ ایک شہر میں ایک آدمی کو گھیرے ہوا تھا اور حیران و پریشان تھے کہ اس شخص کو اس سورج گرہن کا کیسے پتہ چل گیا کہ یہ دیوتا بھی نہیں اور اس نے کافی عرصہ پہلے اس سورج گرہن کی پیشین گوئی کر

دی تھی۔ ناسا کے سائنسدانوں نے نہ صرف اس سورج گرہن والے واقعے کی تاریخ پر مہرِ تصدیق ثبت کردی ہے، بلکہ اس بات کو بھی مانا ہے کہ ایشیائے کُوچک کے ان علاقوں میں جہاں پر یہ لڑائی جاری تھی، یہ ایک مکمل سورج گرہن تھا۔ یہ پیشین گوئی کرنے والا شخص، تھے لیز تھا جو متفقہ طور پر دنیا میں پہلا فلسفی مانا جاتا ہے۔

علمِ نجوم جو بعد میں ترقی کر کے علمِ ہیت بنا، دنیا کے قدیم ترین علموں میں سے ہے۔ بابل اور مصر کے لوگ آج سے ہزاروں سال پہلے اسکے عالم تھے۔ اسکی ابتدا تو شاید اس وقت ہوئی ہوگی جب انسان نے اپنی تاریک راتوں میں سفر کرنے کیلیے ستاروں کی طرف دیکھا ہوگا اور سینکڑوں، ہزاروں سالوں کے مشاہدے نے اسے سکھلا دیا کہ آسمان میں کچھ ستارے ایسے بھی ہیں، جو ہمیشہ ایک ہی سمت کا تعین کرتے ہیں اور ان سے دوسری سمتوں کا تعین بآسانی ہوسکتا ہے، لیکن اس علم کو ترقی اس وقت ملی جب یہ معبدوں کے پروہتوں کے ہاتھ میں آیا۔ اس زمانے کے لوگ اور بہت سارے مظاہرِ فطرت کے ساتھ چاند، سورج اور ستاروں کی بھی پرستش کرتے تھے اور پروہت چونکہ دیوتاؤں کے نائب ہوتے تھے اور انکی بات ہی دیوتاؤں کی بات ہوتی تھی، لہذا یہ ان پروہتوں کی مجبوری تھی کہ وہ اپنے آپ کو اپنے دیوتاؤں کے حالات سے باخبر رکھیں۔ بابل اور مصر کے لوگ آج سے ہزاروں سال پہلے علم نجوم میں کافی ترقی یافتہ تھے۔ ان پروہتوں نے جب انتہائی بلند و بالا معبدوں کے اُونچے اُونچے چبوتروں پر بیٹھ کر تاریک راتوں میں آسمان کے ستاروں کا سینکڑوں سالوں تک مشاہدہ کیا اور اُنکا ریکارڈ رکھنا شروع کیا تو زائچے بن گئے، انہوں نے نہ صرف ستاروں کی گردش اور مختلف موسموں میں اُنکی آسمان میں پوزیشن کو نوٹ کیا بلکہ وہ اس بات پر بھی قادر ہوگئے کہ ستاروں کی پوزیشن کے متعلق پیشین گوئیاں کرسکیں اور اسی سے وہ پروہت سورج گرہن اور چاند گرہن کے متعلق پیشین گوئیاں کیا کرتے تھے۔ یہ ایک انتہائی سائینٹفک علم تھا جو کہ مشاہدہ پر مشتمل تھا لیکن ان پروہتوں نے اس پر طلسم و اسرار کے دبیز پردے ڈالے ہوئے تھے۔ وہ عوام کو گرہنوں کی پیشین گوئی کر کے نہ صرف مرعوب کرتے تھے بلکہ ان کو یہ کہہ کر کہ دیوتا ان سے ناراض ہوگئے ہیں، قربانیوں اور مناجات پر مجبور بھی کردیتے تھے۔

تھیلیز ایشیائے کوچک کے بحیرہ رُوم کے ساحل پر ایک یونانی نوآبادی آئیونیا کے شہر مائیلیٹس کا باشندہ تھا۔ اسکے نسل کے بارے میں مورخ آج تک متفق نہیں ہوسکے، بہت سارے مؤرخین کا کہنا ہے کہ وہ یونانی الاصل تھا لیکن قدیم اور نامور یونانی مؤرخ ہیروڈوٹس کا کہنا ہے کہ وہ فونیشی الاصل یعنی ایشیائی تھا۔ تھے لیز 624 ق۔م میں مائیلیٹس میں پیدا ہوا اور 546 ق۔م میں وہیں وفات پا گیا۔ تھے لیز کا عہد تاریخ کا ایک انتہائی اہم دور ہے، یہ وہ زمانہ تھا جب علم کا مرکز ایشیا سے مغرب کی طرف منتقل ہو رہا تھا۔ قدیم اور عظیم مصری تہذیب اپنی آخری سانسیں لے رہی تھی اور میسوپوٹیمیا کی تہذیب، ایرانی فاتحین کے ہاتھوں تخت و تاراج ہو رہی تھی، گو ابھی دَم خم باقی تھا۔ آئیونیا کی شہری ریاستوں کے مصر اور بابل کے ساتھ دوستانہ اور تجارتی روابط تھے اور انہی خوشگوار تعلقات کی وجہ سے تھیلیز کو اپنی جوانی میں ان علاقوں کے سفروں کے مواقع ملے۔ بابل کے سفر کے دوران اس نے وہاں سے علم نجوم یا علم ہیت سیکھا تھا۔ اسکا مصر کا سفر بہت یادگار رہے۔ مصر کی تہذیب ہزاروں سال پرانی ہے، اور جب تھیلیز نے اہرامِ مصر دیکھے تو انکو تعمیر ہوئے بھی تقریباً دو ہزار سال ہو چکے تھے۔ مصر میں تھیلیز نے جیومیٹری اور ریاضی کا علم حاصل کیا۔ مصر میں اس کا ایک واقعہ تو بہت ہی مشہور ہے۔ مصر میں قیام کے دوران اسکے علم کا شہرہ ہو چکا تھا۔ اہلِ مصر نے اس سے پوچھا کہ تم بتاؤ ہمارے اہرام کی اونچائی کتنی ہے کہ یہ بات ان کیلیئے ایک چیستان تھی۔ تھیلیز نے کہا یہ تو کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ اس نے ان سے کہا کہ ریگستان میں ایک چھڑی گاڑ دو، جب چھڑی کا سایہ اسکی اصل لمبائی کے برابر ہوگیا تو تھیلیز نے کہا اب اہرام کا سایہ ماپ لو، وہ بھی یقینا انکی اصل اونچائی کے برابر ہوگا، یہ بظاہر سامنے کی بات نظر آتی ہے لیکن تھیلیز نے یہ بات کر کے یقیناً اہلیانِ مصر کو ششدر کر دیا ہوگا۔ مصر میں اسکے قیام کے دوران اسکی دریائے نیل کی طغیانی، کہ جس پر مصر کا دارومدار آج بھی ہے، کے بارے میں تحقیقات بھی کافی مشہور ہیں۔

تھیلیز کی کوئی تحریر باقی نہیں ہے اور بعض مؤرخین کے نزدیک اس نے کوئی کتاب لکھی بھی نہیں تھی، اس بات پر بہرحال مؤرخین و فلاسفہ کا اختلاف ہے۔ تھیلیز کے فلسفے کو دوام ارسطو نے اپنی مختلف کتب میں بیان کر کے بخشا ہے۔ ارسطو نے نہ صرف اسکے فلسفے پر بحث کی ہے بلکہ اسکے حالاتِ زندگی کا بھی ذکر کیا ہے۔ اپنی کتاب سیاسیات میں ارسطو نے اسکے علمِ نجوم میں مہارت کا قصہ بیان کیا ہے۔ ہوا یوں کہ لوگ اسکو غربت کا طعنہ مارا کرتے تھے کہ یوں تو بڑے عالم فاضل بنے پھرتے ہو اور بھوکوں مر رہے ہو، اسنے کہا، اچھا اگر یہ بات ہے تو پھر دیکھنا۔ اس نے علم ہیت میں اپنی مہارت سے اندازہ لگایا کہ اس سال گرما میں موسم کچھ اسطرح کا ہوگا کہ زیتون کی فصل بہت اچھی ہوگی، لہذا اسنے مائیلیٹس اور اسکے ملحقہ علاقوں کے زیتون کا تیل نکالنے والے تمام کارخانے اپنے نام بُک کروالیے۔ یہ سردیوں کا موسم تھا، کارخانے بند پڑے تھے اور اسکے مقابل کوئی بولی لگانے والا بھی نہیں تھا، لہذا اسے بڑے مناسب داموں پر یہ کارخانے مل گئے۔ جب موسمِ گرما میں زیتون کی فصل آئی تو وہ واقعی بہت شاندار تھی، اب ہر کسی کو تیل نکالنے کیلیے کارخانے درکار تھے، تھیلیز نے اپنی من مرضی کے نرخوں پر وہ کارخانے چلائے اور کثیر سرمایہ کمایا اور لوگوں سے کہا کہ دیکھو اگر فلسفی اور علما دولت کمانا چاہئیں تو بہت کما سکتے ہیں لیکن اُنکے مقاصد اور طرح کے ہوتے ہیں، یہ تو ارسطو کی بیان کردہ کہانی تھی، اس واقعہ پر ایک ستم ظریف فلسفی نے یہ اضافہ کیا کہ اس تمام قصے میں نہ تو علمِ نجوم میں مہارت درکار تھی اور نہ ہی زیتون کی بہت اچھی فصل کی، بلکہ یہ تو

سیدھا سادا تاجرانہ اجارہ داری کا واقعہ ہے۔ اسکا ایک اور واقعہ بھی مشہور ہے ایک دفعہ شام کو وہ کہیں جا رہا تھا اور چلتے چلتے آسمان میں ستاروں کا مشاہدہ بھی کر رہا تھا کہ ایک گڑھے میں گر گیا، اس پر وہاں پر موجود لڑکیوں نے اسکی خوب سبکی کی کہ آسمانوں کی خبر تو رکھتا ہے اور پاؤں کی خبر نہیں۔

تھیلیز کو دنیا میں متفقہ طور پر پہلا فلسفی اور سائنسدان مانا جاتا ہے اور اسکے ساتھ، فزکس جیومیٹری اور ریاضی کا موجد بھی، جیومیٹری کو مصریوں نے بہت پہلے ترقی دی تھی اور تھیلیز نے یہ علم انہی سے سیکھا تھا لیکن اس وقت تک یہ علم بغیر کسی قواعد وضوابط کے تھا، تھیلیز نے سائنسی بنیادوں پر جیومیٹری کے قواعد وضوابط منظم کیے اور تھیورم پیش کئے جو بعد میں اقلیدس نے بیان کئے اور آج تک ساری دنیا میں پڑھائے جاتے ہیں۔ فلسفے اور سائنس کا بانی اس لحاظ سے وہ پہلا آدمی تھا جس نے اس کائنات کے وجود میں آنے کی وجوہات کی علمی اور عقلی توجیہات بیان کیں۔ اس سے پہلے جب بھی کوئی سوال پوچھتا تھا کہ دنیا کیسے وجود میں آئی تو ہر طرف سے یہی جواب ملتا تھا کہ اس دیوی اور دیوتاؤں نے بنایا ہے۔ اس نے آفرینش کائنات کے بارے میں مادی اسباب کا فلسفہ بیان کیا اور کہا کہ دنیا پانی سے وجود میں آئی ہے۔ اس نے اور بھی نظریات پیش کیے جو آج کی دنیا کو بچگانہ معلوم ہوتے ہیں مثلاً یہ کہ زمین چپٹی ہے اور پانی کی سطح پر تیر رہی ہے اور کائنات دیوی دیوتاؤں سے بھری ہوئی ہے، لیکن تھیلیز کا تاریخ انسانیت میں یہ کارنامہ نہیں ہے کہ اس نے پانی کو بنیاد مانا بلکہ یہ ہے کہ اس نے علوم کو خرافاتی پردوں کی دبیز تہوں سے نکال کر خرد کی بات کی اور انسان کو یکا یک خرافات اور اسطوریات کی دنیا سے نکال کر خرد افروز تحریک کی بنیاد رکھی۔ بقولِ غالب، میں چمن میں کیا گیا گویا دبستان کھل گیا۔ تھیلیز کے بعد یکے بعد دیگرے بہت سارے فلسفی آسمانِ علم وعقل پر نمودار ہوئے اور اپنے اپنے نظریات پیش کیئے۔ جن میں سب سے پہلے اسکا شاگردِ رشید انا کسی مینڈر تھا، اس نے کہا کہ یہ کائنات

پانی سے نہیں بنی بلکہ ایک لامحدود زندہ شے ہے۔ یہی انا کسی مینڈر تھا جس نے ڈارون سے دو ہزار سال پہلے نظریہِ ارتقا پیش کیا اور اسکی ایک دلیل یہ دی کہ انسان کا بچہ پیدا ہوتے ہی، دوسرے حیوانات کی طرح اپنی خوراک تلاش نہیں کر سکتا اور اسکا دودھ پینے کا عرصہ بھی زیادہ ہوتا ہے، اسلئے اگر انسان شروع ہی سے ایسا ہوتا تو کبھی زندہ نہ رہ سکتا تھا، لہذا وہ حیوانوں ہی کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ اسکے بعد انا کسی مینڈر نے کہا کہ گو کائنات کا اصول مادی ہے لیکن یہ ہوا سے بنی ہے۔ ہیرقلیتس نے کہا نہیں یہ کائنات آگ سے بنی ہے۔ ایمپیڈ کلیس نے عناصرِ اربعہ کا نظریہ پیش کیا اور کہا کہ کائنات آگ، ہوا، مٹی اور پانی سے مل کر بنی ہے اور یہی عناصرِ اربعہ کا نظریہ ہے جو آج تک مسلم صوفیوں میں مقبول ہے۔

ایک مفکر، سائنسدان، ریاضی دان، ماہرِ علمِ نجوم اور جیومیٹری ہونے کے ساتھ ساتھ، تھیلیز انجینیئر اور سیاست دان بھی تھا۔ ان دنوں مائیلیٹس ایک بہت بڑا تجارتی شہر تھا اور وہاں غلاموں کی بہت بڑی آبادی موجود تھی اور امیر وغریب طبقے کی کشمکش عروج پر تھی۔ پہلے عوام نے شہر پر قبضہ کیا اور طبقہ اشرافیہ کے بیوی بچوں کو قتل کر دیا۔ اسکے بعد اشرافیہ نے شہر کو فتح کیا اور غلاموں کو زندہ جلا دیا۔ اسی طرح کے حالات ایشیائے کوچک کی دیگر یونانی شہری ریاستوں کے تھے۔ اس پر مستزاد یہ کہ ایرانیوں نے میسوپوٹیمیا کے علاقے فتح کرنے کے بعد اپنا رُخ مغرب کی طرف کیا ہوا تھا اور یہ شہری ریاستیں انکی مستقل زد میں تھیں۔ انہی حالات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے، تھیلیز نے شہری ریاستوں کی ایک فیڈریشن کا نظریہ پیش کیا جسکو پذیرائی نہ ملی۔

نظریے کو پذیرائی ملی ہو یا نہ، لیکن تھیلیز کو اپنی زندگی میں ہی بہت پذیرائی مل گئی تھی۔ عمر کے آخری حصے میں اسے عوام کی جانب سے سوفوس یا فلسفی اور حکیم کا خطاب مل چکا تھا۔ قدیم یونانیوں نے سقراط سے پہلے کہ سات دانشور آدمیوں کی فہرست میں اسے نمبر ایک کے درجے پر رکھا ہوا تھا۔ تھیلیز کے بہت سارے مقولے بھی مشہور ہیں۔ جیسے کسی نے اس سے پوچھا کہ خدا کیا ہے، اس نے کہا جس کی نہ ابتدا ہے اور نہ انتہا۔ لوگوں نے پوچھا، انسان امن وسکون اور انصاف کے ساتھ کیسے رہ سکتا ہے، تھیلیز نے کہا، اسطرح کہ ہم ہر وہ کام چھوڑ دیں جسکا دوسروں کو الزام دیتے ہیں۔ کسی نے کہا سب سے مشکل کام کیا ہے، اسنے کہا اپنے آپ کو جاننا۔ اور سب سے زیادہ آسان کام، کسی نے فوراً پوچھا۔" مشورہ دینا" تھیلیز نے جواب دیا۔

حاصلِ مطالعہ- عاصی صحرائی

☆ ہم اُس بدنصیب معاشرے کا حصہ ہیں جہاں حسن کا معیار گورا رنگ، عقل کا معیار انگریزی زبان ہے۔ اور کردار کی بجائے گاڑی، کوٹھی، کار اور کپڑوں کو دیکھا جاتا ہے۔

☆ معلوم ہے کہ پاکستان میں لوگ ٹینکوں کے آگے کیوں نہیں لیٹتے کیونکہ اس ملک میں کوئی طیب اُردگان نہیں۔

☆ غیرتمند بھائی نے قندیل بلوچ کو قتل کر دیا۔ ڈرو اُس وقت سے جب غیرت کے نام پر بہنوں نے قتل شروع کر دیئے۔

☆ تنقید کے لئے علم کا ہونا ضروری ہے، نکتہ چینی کے لئے جہالت ہی کافی ہے۔

☆ پیسہ حیثیت بدل سکتا ہے اوقات نہیں۔

☆ ہم شیعہ سُنی، وہابی سب مل کر سینما میں فلم تو دیکھ سکتے ہیں مگر ہم سب مل کر ایک مسجد میں باجماعت نماز نہیں ادا کر سکتے۔

☆ بیٹے ہمیشہ باپ کی زمین بانٹتے ہیں مگر بیٹیاں ہمیشہ باپ کا دُکھ بانٹتی ہیں۔

☆ زندگی میں ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب انسان ہر رشتے کی حقیقت سے واقف ہو جاتا ہے۔ تب تک کچھ لوگ دلوں میں جگہ بنا لیتے ہیں اور کچھ لوگ ہمیشہ کے لئے دل سے اُتر جاتے ہیں۔

رومان کی شاعرہ پروین شاکر

اے آر راجپوت

پاکستان کی معروف شاعرہ پروین شاکر 24 نومبر 1952ء کو سندھ کے مشہور شہر کراچی میں پیدا ہوئیں ان کے والد سید شاقب حسین خود بھی شاعر تھے اور شاکر تخلص کیا کرتے تھے انہیں کی نسبت سے پروین شاکر اپنے نام کے ساتھ شاکر تخلص لکھا کرتی تھیں۔ پروین شاکر کے والد انڈیا سے ہجرت کر کے پاکستان آ گئے پروین شاکر کی ابتدائی تعلیم گھر ہی میں ہوئی بعد رضیہ گرلز اسکول کراچی سے آئی اے اور انگلش لٹریچر کے ساتھ بے اے آنرز کیا۔ 1972ء میں کراچی یونیورسٹی سے ایم اے انگلش کا امتحان پاس کیا لسانیات میں ایم اے کیا اور پی ایچ ڈی کے لئے ''جنگ میں ذرائع ابلاغ کا کردار'' پر مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی ہوگئیں اس کے بعد ہاورڈ یونیورسٹی امریکہ سے وابستہ ہوگئیں جہاں سے بینک ایڈمنسٹریشن میں ایم اے کیا۔ اس کے بعد عبداللہ گرلز کالج کراچی میں انگلش میں لیکچرار کی حیثیت سے کام کیا۔ نو برس تک درس و تدریس سے منسلک رہیں اس کے بعد سول سروس یعنی سی ایس پی کا امتحان دیا اور کامیاب ہوگئیں محکمہ کسٹمز میں کلکٹر ہوگئیں اس عہدے سے ترقی کرتے ہوئے پرسنل سیکریٹری پھر سی بی آر اسلام آباد مقرر ہوئیں۔

1976ء میں خالہ زاد بھائی ڈاکٹر نصیر علی سے رشتہ ازدواج میں منسلک ہوگئیں جو ملٹری میں ڈاکٹر تھے۔ ان سے ایک بیٹا ہوا جس کا نام سید مراد علی رکھا۔ ہم آہنگی نہ ہونے اور مزاجوں میں بہت فرق ہونے کی وجہ سے یہ شادی نہ چل سکی اور 1989ء میں طلاق ہوگئی۔ پروین شاکر نے 15 سال کی عمر میں شاعری شروع کی تھی اور کل بیالیس سال کی عمر میں وفات پائی اس طرح انہوں نے ستائیس سال شاعری کی۔

انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ نسوانی جذبات کی بہترین عکاسی کی بلکہ اپنے جذبات کے ساتھ ساتھ خواتین کے حقیقی جذبوں کی عکاسی، ان کا پہلا شعری مجموعہ پھول بہت زیادہ مقبول ہوا۔ نرم دل خاتون تھیں بے حد مہذب اور ذہین ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا شکل وصورت بھی بہت خوبصورت تھی۔ اپنے پہلے مجموعہ خوشبو کے دیباچہ میں لکھتی ہیں۔ ہوا نے جب پھول کو چوما تو خوشبو نے جنم لیا خوشبو کھلتی ہوئے کلی کی مسکراہٹ بھی ہے اور مرجھائے ہوئے شگوفہ کا نوحہ بھی، جو ہوا کی سانسوں میں اُتر کر خزاں نصیب درختوں کی مسیحائی کرتا ہے اور اس کے لئے خود جان سے گذر جاتی ہے۔

پروین شاکر کی جتنی اچھی غزلیں ہیں اتنی ہی اچھی اس کی آزاد نظمیں ہیں۔ خوبصورت لفظوں کا استعمال پروین شاکر کے کلام کا وصف رہا ہے ان کی شاعری میں چاند خوشبو، پھول رات شیر موسم اور خواب کے استعارے استعمال ہوئے ہیں۔ پروین شاکر کو پانچ بڑے ادبی ایوارڈوں انعامات واعزازات سے نوازا گیا۔ جن میں آدم جی ایوارڈ علامہ اقبال ایوارڈ فیض احمد فیض ایوارڈ۔ یو ایس آئی ایس ایوارڈ، تمغہ حسن کارگردگی۔ پروین شاکر کی رُومانیت میں نیا پن تھا اور شعر خوبصورت انداز میں پیش کرنا خوب جانتی تھی ان کی شاعری میں رُومانیت کا رنگ بھی تھا اور مرد کی فطرت پر گہرا طنز بھی۔ پروین شاکر کی شعری مجموعوں کے نام یہ ہیں۔

۱۔ ماہ تمام۔ ۲۔ خوشبو۔ ۳۔ کف آئینہ۔ ۴۔ خود کلامی۔ ۵۔ صد رنگ۔ عکس خوشبو۔ انکار۔ پروین شاکر 26 دسمبر 1994ء میں اسلام آباد میں ایک ٹریفک حادثہ میں انتقال کر گئیں۔ یہاں اُن کا کلام پیش خدمت ہے۔

ماں

چوہدری نعیم احمد باجوہ

''ماں کی دعا جنت کی ہوا'' کا فقرہ زبان زد عام ہے۔ لاریوں، ٹرکوں پر جا بجا لکھا ہوا پایا جاتا ہے۔ بچپن سے پڑھتے سنتے آئے ہیں پھر جب ذرا ہوش سنبھالا تو ہمیں الجنت تحت اقدام الامہات پڑھایا گیا۔ جنت ماں کے قدموں تلے ہے۔ اسکی تفصیلات یوں معلوم ہوئیں کہ شرف انسانیت کے قیم، رحمۃ للعالمین ﷺ کے اس ارشاد گرامی میں معلومات اور حکمت کا خزانہ پوشیدہ ہے۔ آپ ﷺ سے قبل دور جاہلیت میں عورتوں کی قدر کچھ نہ تھی۔ ان کے ساتھ وحشیانہ سلوک کیا جاتا۔ خرید و فروخت کا معاملہ بھی عام تھا۔ اور بعض قبائل میں بچیوں کو زندہ درگور کرنے کا رواج تھا۔ باپ کی وفات کے بعد اسکی بیوہ یعنی ماں سے نکاح رچانے کو بھی برا نہ سمجھا جاتا۔ عربی ادب ان قصے کہانیوں سے بھرا پڑا ہے جن میں عورت کی تذلیل اور بے عزتی بیان ہو۔ عورت کو کھیلنے کودنے کی ایک چیز کے طور پر دیکھنا اور استعمال کرنا بہر حال عام تھا۔ پھر جب ظہور رحمۃ للعالمین ہوا تو آپ ﷺ نے طبقہ نسواں کے حقوق کی بات کی جو یقیناً اس معاشرے میں اجنبی خیال کی جاتی تھی۔ یہ صدا ان فرسودہ اور بیہودہ رسموں سے بغاوت جیسی تھی۔ لیکن آپ ﷺ کے بلند حوصلے مضبوط عزم و ہمت اور بیمثل یقین وایمان نے اس بے راہ رو اور سرکش دریا جیسے معاشرے کا رخ موڑ دیا۔ عورت کا احترام اور وہ بھی عرب معاشرے میں ناممکن معلوم ہوتا تھا۔ لیکن رحمۃ اللعالمین ﷺ کی انتھک محنت، دعاؤں اور عمل سے یہ خیال حقیقت میں بدلنے لگا۔ صبح نو روشن لگی۔ بچیوں کو در گور کرنے والے اپنے گناہوں پر نادم اور شرمندہ ہو کر آستانہ عالیہ پر حاضر ہو کر مغفرت کی دعا کے خواستگار ہونے لگے۔ شادی بیاہ میں اپنی مرضی کے حق سے محروم بچیوں کی پسند کا خیال رکھا جانے لگا۔ انکی مرضی معلوم کرنا ضروری ٹھہرا اور معلوم کی جانے لگی۔ دن رات خاوندوں کے جبر وستم کا شکار بیویاں سکھ کا سانس لینے لگیں۔ بچیوں کی عمدہ تربیت کرنے والے کے لئے جنت کی خوشخبری کا

اعلان ہوا۔ والدین اپنا حق چھوڑ کر بچوں پر قربان کرنے لگے۔ الغرض معاشرے میں عورت کا ہر روپ قابل فخر، قابل عزت و ادب ٹھہرنے لگا۔ یہ سب برکات تھیں رحمۃ للعالمین ﷺ کی عورتوں کے حقوق کے لئے جہد مسلسل کی۔ نہ صرف اس زمانے کی عورت بلکہ تا قیامت ہر رنگ و نسل اور خطے کی عورت زیر بار احسان آ گئی۔ واقعی

بھیج درود اس محسن پر تو دن میں سو سو بار
پاک محمد مصطفی ﷺ نبیوں کا سردار

یوں تو آپ ﷺ نے عورت کے ہر روپ کا احترام قائم فرمایا پر جس احترام اور ادب و عزت سے ماں کی تکریم قائم ہوئی وہ بہت غیر معمولی ہے۔ ماں کو جنت کی ہو، ایا جنت کی سیڑھی یا دروازہ قرار نہیں دیا بلکہ جنت کو ماں کے قدموں تلے رکھ دیا۔ اس مختصر لیکن پر حکمت و پر مغز کلام مبارک پر غور کرتے جایئے اور درود و سلام پڑھتے جایئے۔ سوچتے جایئے اور عش عش کرتے جایئے۔ اس فقرے کے کچھ معنی تو یوں بھی ہو سکتے ہیں:

۱) جنت حاصل کرنی ہے تو ماں کی خدمت سے ملے گی۔

۲) یہ جنت دنیوی ہو یعنی آرام اور سکون کی گھریلو جنت یا بعد الموت اخروی جہان کی جنت ہر دو جنت یا جنتان کے حصول کی چابی ماں کے قدموں میں رکھ دی۔ جاؤ اور اٹھا لو چابی اپنی جنت کی۔ لیکن اسکے لئے جھکنا پڑے گا جنت کی چابی ماں کے پاؤں تلے ہے۔ پورے ادب پورے احترام سے جھک کر لے لو۔ ذرہ برابر اکڑ، کجی اور تکبر باقی رہا تو چابی کو چھو نہ پاؤ گے، جنت تک پہنچ نہ پاؤ گے۔

۳) یہ معنی بھی اس پر حکمت کلام میں داخل ہیں کہ معاشرے کی تشکیل میں ماں کا کردار بہت بڑا ہے۔ فرد جو معاشرے کا لازمی وجود ہے وہ بڑا ہو کر کیا بنے گا۔ چور اچکا بنے گا یا مفید وجود۔ معاشرے کو برباد کرنیوالا ہوگا یا تعمیر میں حصہ لینے والا۔ اسکا فیصلہ ماں کی گود کریگی۔ اس کلام بے نظیر نے ماں کو بھی باندھ کے رکھ دیا۔ رتبہ بھی کمال عطا فرمایا۔ پر جتنا بڑا رتبہ اتنی بڑی ذمہ داری۔ جتنا بڑا مقام عزت اتنا بڑا مقام خوف۔ ماں فیصلہ کریگی کہ کل کا معاشرہ کیسا ہو۔ ماں وہ پنیری پیدا کریگی جو کل تناور درخت ہونگے۔ وہ درخت سایہ دار ہونگے پھلوں سے لدے ہوئے یا کانٹوں کے جھنڈ۔ ماں اپنے دکھ اور قربانیوں کا ایک حصہ تو پہلے ہی ادا کر رہی تھی آج بھی کر رہی ہے۔ گھرانہ امیر ہو یا غریب ماں کی تکلیف ماں کا درد ماں کا دکھ سانجھا ہے ایک جیسا ہے۔ تخلیق کبھی بھی آسان نہ تھی ماں خالق کی ظل ہے۔ اسکے وجود میں بحکم کن تخلیق ہوتی ہے۔ کوئی تخلیق درد اور pain سے گزرے بغیر ممکن نہیں۔ ماں کے شکم میں لمحہ لمحہ تخلیق آگے بڑھتی ہے۔ لمحہ لمحہ اور دھڑکن دھڑکن اپنے بچے کو پالتی ہے۔ جسم کا ایک حصہ اس سے الگ ہوتا ہے۔ ماں سے زیادہ تخلیق کی تکلیف اور کون جان سکتا ہے۔ جب اس ہستی یعنی ماں کو کوئی دکھ دے تو وہ مورکھ انسان کیسا ہوگا۔ وہ تو انسان کہلانے کا مستحق نہیں رہتا کیونکہ انسان میں تو دو طرح کے انس رکھے گئے تھے۔

پھر وہ انسان کہلا کر ظالم کیسے بن سکتا ہے۔ انسان کہلا کر ماں کی توہین کیسے کر سکتا ہے۔ یہ دو باتیں اکھٹی تو ہو نہیں سکتیں۔ ماں کو دکھ دینے والوں کا حشر کیسا ہوگا۔ ہر صاحب فراست کی روح اس نظارے کو محسوس کر کے کانپ اٹھتی ہے۔ پر آج ہم نے بحیثیت معاشرہ ماں کو صرف دکھ نہیں دیا ہم نے ماں کو مار دیا ہے اور ہر روز مار رہے ہیں۔ گولی کسی کو لگے مرتی تو ماں ہی ہے۔ ماں کی آہیں اور نالے آج وطن عزیز کی گلی گلی سے اٹھ رہے ہیں۔ کبھی اس بچاری کی صدا اٹھتی ہے گوجرانوالہ کے جلتے مکانوں سے۔ کبھی یہ بھسم کر دینے والی دعا نکلتی ہے بھسم ہوتی ہوئی فیکٹری سے۔ کبھی ماڈل ٹاؤن سے تو کبھی گڑھی شاہو سے۔ کبھی قصور کی گلیوں سے تو کبھی سیالکوٹ کے بازاروں سے۔ کبھی ہزارہ کی سڑکوں پر اور کبھی بلند و بالا چوٹیوں پر۔ ماں کرلاتی رہی چیختی چلاتی رہی پر ہم نے کان بند کر لئے۔ ماں بلاتی رہی مگر ہم نے آنکھیں بند کر لیں۔ کبھی ہم نے سوچا شیعہ کی ماں رو رہی ہے کبھی ہم نے کہا احمدی کی ماں ہے۔ کبھی ہم نے کہا غریب کی ماں تھی۔ کاش ہم ماں کو تقسیم نہ کرتے کاش ہم ماں کو دکھی نہ کرتے تو آج ہم بھی دکھی نہ ہوتے۔ ماں ماں ہوتی ہے۔ ماں شیعہ، سنی احمدی، بریلوی، ہزاروی نہیں ہوتی۔ یہی فرمایا تھا کہ جنت ماں کے قدموں تلے ہے۔ کسی خاص مذہب، خاص فرقے، خاص رنگ و نسل، غریب یا امیر ماں کے قدموں تلے جنت کی خوشخبری نہ دی تھی۔ ماں کے قدموں تلے جنت ہے۔ اگر ہم چشم تصور میں وطن عزیز کے گلی کوچوں سے اٹھنے والی ماں کی آہیں دیکھ لیں۔ قصور کے بچوں کی بے قصور ماں کی پکار سن لیں، کبھی ان کان پھاڑتی صداؤں کو سن لیں تو یقین کریں ہم سو نہ سکیں ہم ہنسنا چھوڑ دیں۔ ہم ماں کو تقسیم کرنا چھوڑ دیں۔ ماں میں بڑی طاقت ہے برداشت کی ہمت اور حوصلہ بھی ہے۔ آؤ ماں کی طاقت کو صحیح معنوں میں استعمال کریں۔ ماں کی دعاؤں کی طاقت طوفانوں کے رخ موڑنے کے قابل ہے۔ ماں کا حوصلہ چٹانوں کو ریزہ ریزہ کرنے کے قابل ہے۔ ماں کی برداشت پہاڑ جیسی ہوتی ہے اور ماں کی دعا عرش الٰہی کو ہلا دیتی ہے۔ آؤ اپنی کھوئی ہوئی جنت کو تلاش کریں کہ ایک معاشرے میں رہتے ہوئے تم جنت کو ٹھوکر مار کر کس جنت کی تلاش میں ہو۔ دوسرے کی جنت اجاڑ کر تم کونسی جنت بسانے چلے۔ میرے آقا و مولیٰ ﷺ نے فرمایا اپنے والدین کو گالی نہ دو۔ عرض کیا ایسا بد بخت کون ہوگا جو اپنے ہی والدین کو گالی دے۔

فرمایا جب تم کسی کے والدین کو گالی دیتے ہو تو گویا اپنے ہی والدین کو برا بھلا کہہ رہے ہوتے ہو۔ وہی معاشرہ انسانوں کا معاشرہ ہو سکتا ہے جہاں ادب و احترام یک طرفہ نہ ہو دو طرفہ ہو اور یک طرفہ ہو بھی نہیں سکتا۔ ہمیں درس دیا گیا تھا کہ جو اپنے لئے چاہتے ہو وہی اپنے بھائی کے لئے پسند کرو۔ پرستیاناس ہو اس خود غرضی کا جس نے یہ عظیم لشان درس بھی ہمیں بھلا دیا۔ اور آج نفسی نفسی کرتے کرتے ہم بہت دور نکل

گئے۔ اپنی خوشی کے لئے دوسروں کی خوشی سے کھیلنے لگے۔ پر کبھی ہم نے سوچا کہ دہشت گردی کے ہر واقعہ میں، قتل وغارت کی ہر واردات میں، ظلم کی ہر کہانی میں، سب سے زیادہ متاثر ماں ہوتی ہے۔ سب سے زیادہ ماں رلتی ہے۔ ماں فوجی جانباز کی ہو یا غیر فوجی کی، امیر کی ہو یا غریب کی شیعہ ہو یا سنی بریلوی ہو یا دیو بندی پنجابی ہو یا ہزاروی سندھی ہو یا بلوچی۔ حرا کی ماں ہو کہ، کائنات کی ماں، مارنے والے کی ماں ہو کہ مرنے والی کی۔ دہشت گرد کی ماں ہو کہ دہشت کا نشانہ بننے والے کی۔ ماں کا ایک ہی روپ ہے۔ ماں ماں ہے۔

اگر ہم چشم تصور میں ماں کی شعلوں جیسی بلند ہوتی آسمان کو چھوتی آہیں دیکھ لیں عرش کے پائے ہلانے والی ان زاریوں کو محسوس کر لیں تو کسی کی ماں کو دکھ دینے کا کبھی سوچیں بھی نہ۔ کسی کی جنت اُجاڑنے کا خیال بھی دل میں نہ آئے۔ کیا ہوا کہ تاشفین ملک نے اپنی چار ماہ کی بچی چھوڑ کر مرنا پسند کر لیا۔ اسکی ممتا بھی ہم نے ماردی۔ ماں مری تو اسنے یہ قدم اُٹھایا۔ ماں بے چین ہے اور ہم چین کی تلاش میں۔ جب تک ماں بے حال ہے ہم بھی بے حال رہیں گے۔ جب تک ماں پائمال ہے ہماری پائمالی بھی روز بروز بڑھتی رہیگی۔ قبل اسکے کہ ماں کے آنسو اتنا بڑا سیلاب بن جائیں کہ خس و خاشاک بہہ جائیں قبل اسکے کہ ماں کی آہیں بجلیاں بن کر کڑکیں اور سب کچھ جلا کر راکھ کر دیں قبل اسکے کہ ماں کی آنکھوں کی سرخی آسمان پر منتقل ہو اور وہ آگ بگولہ ہو جائے قبل اسکے کہ ماں کا دل ٹوٹنے سے آسمان ٹوٹ پڑے قبل اسکے کہ ماں کے بکھرے بال ہمیں تنکوں کی طرح بکھیر دیں، قبل اسکے کہ ماں کا ننگا سر ہمارے سارے ننگ ظاہر کرنے کا موجب بن جائے۔ قبل اس کے کہ اسکے اُٹھے ہوئے ہاتھ ہمیں اس جہاں سے ہی اُٹھا دیں۔ قبل اس کے کہ ہماری ان کرتوتوں کی سیاہی ہمارے دل و دماغ اور نامہ اعمال سیاہ کر دے۔ آؤ ماں کو منالیں۔ ہم ماں کا سر ڈھانپ دیں اسکے بال سنوار دیں اسکی دلجوئی کر لیں۔ اسکو تھام لیں اور گرنے سے بچالیں۔ اگر ماں گر گئی تو ہم کبھی اُٹھ نہ سکیں گے۔ آؤ اس کی آہیں دعاؤں میں بدل دیں۔ آنکھوں کی سرخی محبت میں بدل دیں آنسو پونچھ دیں۔ ماں تو ماں ہے وہ معاف کر دیگی آہیں دعا میں بدل جائیں گی آنسو خوشی کے آنسو ہو جائیں گے دست بد دعا دست شفقت بن جائے گا۔ ہماری جنت کی چابی مرنے مارنے، پھٹنے اور پھاڑنے میں نہیں۔ ماں کے قدموں تلے ہے۔ ایک بار اس کی طرف متوجہ تو ہوں۔ ایک بار اس کے پیر محبت سے چھوئیں تو سہی۔ جب اسکے پاؤں پہ جھکیں گے وہ پیٹھ تھپتھپائے گی کہے گی۔ میرے لعل، میرے پیارے، خوش رہو، شاد رہو، آباد رہو، بارآور رہو۔ وہ پاؤں اٹھا دیگی ہم جنت کی چابی پا لیں گے۔ آؤ ماں کو منالیں۔ تیری بھی جنت وہاں ہے اور میری بھی۔ حوروں کی تلاش میں نکلنے والے جنت کی چابی ماں کے قدموں تلے بھول گئے۔ ماں آج بھی سر راہ کھڑی راہ تک رہی ہے۔ آؤ ماں کو منالیں۔

اچھی شاعری کی کچھ معروضات

صادق باجوہ میری لینڈ

شاعری قدرت کا عطیہ ہے اور فطرتاً بعض طبائع میں موجود ہوتا ہے جسے وہبی شاعری کا نام دیا جاتا ہے لیکن محنت ریاضت اور مسلسل کوشش س شاعری کسبی بھی ہوسکتی ہے۔ شاعری جذبات واحساسات کے اظہار کا بہترین ذریعہ ہے جو قارئین اور سامعین کے دلوں کو متاثر کرتی ہے بلکہ یوں کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ اچھا شعر خود بولتا ہے اور دوسروں کو اپنی جانب متوجہ کرتا ہے۔ نہ تو تک بندی شاعری کہلاسکتی ہے اور نہ ہی متشاعر شاعر بن سکتا ہے۔ معروف شاعر وادین احمد صدیقی کے بقول: اچھی شاعری کرنے کے لئے یہ ضروری ہوتا ہے کہ شاعر الفاظ کا رمز آشنا ہو۔ یعنی اسے یہ ہنر آتا ہو کہ وہ الفاظ کو نگینے کی طرح جڑ سکے۔ زبان کا واجبی سا علم کافی نہیں ہوتا۔ یہ شاعر کو تک بند تو بنا سکتا ہے اچھا شاعر نہیں بنا سکتا۔ ایسے فرد کی شاعری واجبی سطح سے اُوپر نہیں اُٹھ سکتی۔'' شاعری میں دلچسپی رکھنے والے مبتدیوں کیلئے چند معروضات درج ذیل ہیں جنہیں مدنظر رکھ کر اچھی شاعری مرتب ہوسکتی ہیں۔

۱۔ فن شاعری میں علم عروض کا کلیدی کردار ہے جس سے بحور اور اوزان متعین ہوتے ہیں۔ اسی طرح کچھ قواعد وضوابط کی پابندی ضروری ہے۔

۲۔ وسیع مطالعہ اور مناسب ذخیرہ الفاظ کی ضرورت ہے۔ تشبیہات واستعارات ہے۔ کوشش یہ ہونی چاہیے کہ ہر لفظ کے انتخاب اور استعمال کا حق ادا ہو بیان کئے گئے مضمون سے بدرجہ اتم واقفیت لازمی ہے۔

3۔ عام فہم نظم موثر ہوتی ہے۔ شعر میں سلاست روانی چاہیے اور کہیں بھی سکتہ یا جھول نہ ہو اور معنی کا مناسب استعمال کریں جہاں تشبیہات واستعارے چسپاں ہوتے ہوں ضرور استعمال کریں۔

۴۔ نظم کے تمام اشعار میں ردیف قافیہ کی پابندی کریں۔ پوری نظم کا ایک جیسا ردیف وقافیہ بھی ہوسکتا ہے اور شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ بھی ہو سکتے ہیں۔

۵۔ نظم کہنے کے بعد تنقیدی جائزہ بھی لیں اور دیکھیں کہ کہیں ادائیگی میں زبان رُکتی تو نہیں اور ہر لفظ معنی ومفہوم کے اعتبار سے مناسب جگہ رکھا گیا ہے یا نہیں۔ اساتذہ فن اور ماہرین کی رائے میں ہر شاعر اور فنکار اپنی تخلیق کا اولین ناقد ہوتا ہے۔

۶۔ ہر نظم کے لئے مناسب زمین تلاش کریں اور اسی زمین اور بحر میں ساری نظم ہو۔ اگر چند اشعار سے مدعا حل ہو جائے تو نظم کو لمبا کرنے سے احتراز کریں۔ طویل نظموں سے اکثر اوقات سامعین اُکتاہٹ محسوس کرتے ہوئے داد کی بجائے بیداد پر اُتر آتے ہیں۔

۷۔اساتذہ اور معروف شعراء کا کلام مطالب و مفاہیم سمجھتے ہوئے پڑھیں۔کلام محمود میں بہت عمدہ اور خوبصورت نظمیں ہیں ان کا بغور مطالعہ کریں۔اگر دیوان غالب مل جائے تو اس کی غزلوں کے ہر شعر کا مفہوم سمجھتے ہوئے مطالعہ کریں۔اگر سمجھ میں نہ آئے تو کسی سے پوچھنے میں ہتک محسوس نہ کریں۔اس طرح علم میں اضافہ ہوتا ہے۔

۸۔اساتذہ اور مشہور معروف شعرا کا کلام یوٹیوب پر سنا اور گوگل میں پڑھا جا سکتا ہے۔بدقسمتی سے ادبی ذوق کے فقدان کے باعث بعض مرتبہ غلط شعر بھی درج کر دئے جاتے ہیں ایسے موقع پر احتیاط ضروری ہے۔

۹۔نظم کہنے کے بعد اچھے شاعر سے اصلاح کروالیں تو نظم میں نکھار پیدا ہو سکتا ہے۔اگر کسی کسے پاس بیٹھ کر اصلاح ہو جائے تو الفاظ کی تبدیلی یا ترمیم کی وجہ پوچھی جا سکتی ہے۔اور بعد میں اسے مدنظر رکھا جا سکتا ہے۔

۱۰۔ابتدا میں اگر میں اگر کسی شاعر کی زمین میں اپنے الفاظ اور مضامین رکھ کر نظم کہیں تو مضائقہ نہیں لیکن ادبی سرقہ سے پرہیز کریں جو ہمیشہ دوسروں کا محتاج بنا دیتا ہے۔

سراپا محبت شاعر غلام محمد قاصر

بلال افتخار رانا

اردو غزل کے نامور شاعر غلام محمد قاصر کو ہم سے جدا ہوئے 11 سال بیت گئے۔قاصر مرحوم جس قدر خوبصورت اور دل نواز شاعر تھے اسی قدر پیارے انسان بھی تھے انسانوں سے محبت کو زندگی کا مقصد سمجھتے تھے اور ہمیشہ اسی پر کاربند رہے خوش گفتاری اور خوش مزاجی ان کا اہم ترین وصف تھا۔ان کی غزل جدید نفسیات اور روایت کے امتزاج کی ایک دل کش تصویر ہے۔ان کی شاعری کو سراہتے ہوئے نامور شاعر ظفر اقبال نے لکھا کہ قصر کی غزل وہاں سے شروع ہوتی ہے جہاں میری غزل ختم ہوتی ہے۔صوفی تبسم نے کہا کی قاصر کا اسلوب بیان میرؔ کی سادہ بیانی، غالبؔ کی تخیل آفرینی اور اقبال کی وسیع نظری کے اُفق سے سرشار ہو کر اُبھرتی دکھائی دیتی ہے۔احمد ندیم قاسمی نے اس انداز میں داد دی کہ قاصر روایت اور جدیدیت کی درمیان تناسب قائم کر کے غزل کو تنزل سے بچا لے گئے۔شہزاد احمد نے یوں تحسین دی کہ قاصر نے بہت سے ایسے گوشوں کی نقاب کشائی کی جو اس سے پہلے کھل کر سامنے نہیں آئے تھے۔

الغرض ان کی شعروں کو ہر سطح پر پذیرائی نصیب ہوئی۔ان کا کلیات (اک شعر ابھی تک رہتا ہے) کے نام سے کچھ عرصہ قبل منظر عام پر آیا ہے جن میں ان کے تینوں شعری مجموعوں کا تسلسل، آٹھواں آسمان بھی نیلا ہے اور دریائے گماں کے علاوہ ان کا غیر مطبوعہ کلام بھی شامل ہے کلیات کی اشاعت کا اہتمام ان کے بچوں عزیزم عماد قاصر، عدنان قاصر اور نیلم قاصر نے کیا جو قابل قدر اور لائق تحسین کارنامہ ہے۔70 کی دہائی میں اردو غزل کو جن شعراء نے تخلیقی ذائقوں اور اسلوب سے روشناس کروایا غلام محمد قاصر کا نام ان میں منفرد حیثیت رکھتا ہے اس کا سبب یہ ہے کہ انہوں نے قدیم شعری روایت اور جدید رنگ سخن کی آمیزش سے ایسی کائناتِ شعر تشکیل دی۔جس سے روایت کو زندگی اور جدت کو توانائی ملی۔تم یونہی ناراض ہوئے ہو ورنہ مئے خانہ کا پتہ میں نے ہر اس شخص سے پوچھا جس کے نین نشیلے تھے۔

مسلمان تاجروں کی سدا بہار یادگار

(ڈاکٹر طارق احمد مرزا۔آسٹریلیا)

عموماً یہی کہا اور سمجھا جاتا ہے کہ آسٹریلیا کو سب سے پہلے برطانوی کپتان جیمز کُک (Captain James Cook) نے 1770 میں ''دریافت'' کیا تھا حالانکہ اس سے کہیں قبل پرتگالی، فرانسیسی اور ولندیزی (Dutch) مہم جُو اس براعظم میں اپنے قدم رکھ چکے تھے لیکن نامساعد حالات نے انہیں یہاں سے رخصت ہو جانے پر مجبور کر دیا، اور پھر ان سے بھی کئی سو برس قبل انڈونیشیا کے مسلمان تاجروں کی آسٹریلیا میں آمد و رفت کے ٹھوس شواہد بھی موجود پائے گئے ہیں جو جدید محققین کے مطابق سن 1500ء سے ہی اس براعظم سے نہ صرف واقف تھے بلکہ یہاں کے مقامی باشندوں کے ساتھ تجارتی اور معاشرتی تعلقات بھی استوار کر چکے تھے۔یہ تعلقات شمالی آسٹریلیا کے ساحلوں میں پائے جانے والے کھیرا نما سمندری جانور (Sea Cucumber) کی وجہ سے شروع ہوئے تھے جس کی یہاں مخصوص مہینوں میں بہتات ہوتی ہے اور جس کی چین میں بے تحاشا مانگ ہوتی تھی چنانچہ انڈونیشیا کے مسلمان تاجر جو ماضی کی ایک مشہور تجارتی بندرگاہ کے حوالے سے Macassans کہلاتے ہیں، ہر سال شمالی آسٹریلیا کا رخ کرتے اور بھاری مقدار میں یہاں سے یہ ''سمندری کھیرے'' پہلے انڈونیشیا اور پھر وہاں سے چین برآمد کر کے کثیر زرمبادلہ کماتے۔مقامی باشندوں کی نسل در نسل مروی تاریخ اور میلبورن کی Monash یونیورسٹی کے ایک محقق John Bradley کے مطابق ان مسلمان تاجروں نے شمالی آسٹریلیا کے قدیم مقامی (Aborigines) باشندوں سے برابری کی سطح پر اور دوطرفہ لین دین کی بنیاد پر یہ تجارتی تعلقات قائم اور استوار کئے تھے اور سفید فام غیر مسلم اقوام کے برعکس ان کی طرف سے کسی استعمار، استحصال یا نسل کشی جیسے گھناؤنے جرائم کے ارتکاب کی روایات یا شواہد موجود نہیں۔

(بی بی سی نیوز اشاعت 24/جون 2014ء زیر عنوان
("When did Islam came to Australia"

اسلامی تصورِ توحید، کچھ عربی الفاظ، بادبانی کشتیوں اور دستکاریوں کے علاوہ

انڈونیشیا کے ان مسلمان تاجروں کی ایک یادگار شمالی آسٹریلیا میں پائے جانے والے املی (Tamarindus Indica) کے سینکڑوں برس پرانے درخت بھی ہیں جو انہوں نے پہلی مرتبہ اس براعظم میں متعارف کروائے۔ یہاں کے شمال مغربی علاقہ جات املی کے ان قدیم سدا بہار درختوں کے لئے مشہور ہیں۔ املی طویل سمندری سفروں میں متلی کے لئے بھی مفید ہوتی تھی اور ملاحوں اور مچھیروں میں وٹامن سی اور زنک (Zinc) کی کمی کی وجہ سے پیدا ہونے والی جلدی اور اندرونی بیماریوں (مثلاً Scurvy) کیلئے بھی امرت دھارا تھی۔ اس کا گودا چٹنی کے طور پر، تو پانی ہیضہ کی صورت میں جسم میں نمکیات اور شکر کی کمی پورا • کرنے کا کام کرتا۔ املی آغاز حمل کی متلی میں بھی مؤثر ہوتی ہے اور اس میں پائی جانیوالی فولک ایسڈ جنین کے اعصابی نظام کی افزائش کرتی ہے۔ آج کل فولک ایسڈ حمل کے پہلے تین مہینوں میں لازماً استعمال کروائی جاتی ہے۔

امریکہ میں ہونے والی ایک تحقیق کے مطابق املی کے سوگرام گودے میں وٹامن سی کے علاوہ ملٹی وٹامن (بی کمپلیکس vitamin , E ,K,A، وغیرہ)، معدنیات (فولاد، کیشیم، زنک، سیلینیم، فاسفورس، میگنیشیم) اور نمکیات (سوڈیم، پوٹاشیم) بھی موجود ہوتے ہیں۔ املی کی گھٹلیوں سے ایسا تیل بھی کشید کیا جاتا ہے جو خشک آنکھوں کی جلن دور کرتا ہے۔

آنکھوں کی ٹھنڈک، جسم کی طاقت اور زبان کی لذت کا سامان کرنے کے علاوہ املی کا چھتنا ور درخت اس زمانہ میں آسٹریلیا کی تپتی دوپہروں میں اپنے گھنے سایہ تلے غریب الوطن اور مقامی مسافروں کو ٹھنڈی چھاؤں بھی فراہم کرتا ہوگا، بقول شاعر ؎

بیٹھ جاتے ہیں جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے
ہائے کیا چیز غریب الوطنی ہوتی ہے !

غزل

میں چمن میں کیا گیا، گویا بستان کھل گیا
بلبلیں سن کر مرے نالے غزل خواں ہوگئیں
واں گیا بھی میں تو ان کی گالیوں کا کیا جواب
یاد تھیں جتنی دعائیں صرف درباں ہوگئیں
ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہوگئیں
رنج سے خوگر ہوا انسان تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہوگئیں
یوں ہی گر روتا رہا غالب تو اے اہل جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہوگئیں

(ڈاکٹر طارق احمد مرزا۔ آسٹریلیا)

کشف المحجوب: یہ ترجمہ ہے یا دخل در معقولات

انتظار حسین

مرسلہ: ندملک کنیڈا

اب کے برس داتا صاحب رحمہ اللہ کے عرس سے ہم آئے تھے کہ ایک بزرگ نے دوٹوک سوال کیا کہ عرس میں آئے ہو مگر کبھی ''کشف المحجوب'' بھی پڑھی ہے۔ ہم نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا کہ اس طرح نہیں پڑھی جس طرح پڑھنے کا حق ہے۔ وہ بزرگ ہم پر مہربان تھے بولے کہ لو تمہیں ہم کشف المحجوب کا ایک ترجمہ دیتے ہیں اسے ذرا پڑھنا اور انصاف کرنا۔ اس ترجمہ کو ہم نے پڑھنا شروع کیا تو ہماری آنکھیں کھل گئیں۔ ہمارے زمانے میں مترجموں میں ایک نیا رجحان یہ پیدا ہوا ہے کہ وہ دخل در معقولات کرتے ہیں۔ مصنف کے بیان کا ترجمہ کرنے پر قناعت نہیں کرتے بلکہ بیچ بیچ میں بولتے جاتے ہیں۔ خواہ غلط ہی بولیں۔ مگر یہ ہمارے گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ سلوک داتا صاحب رحمہ اللہ سے بھی کیا جا سکتا ہے۔ ہم یہ ترجمہ پڑھتے جاتے تھے اور سوچتے جاتے تھے کہ یا اللہ ہم نے کشف المحجوب آگے بھی پڑھی ہے۔ بیان بدلا بدلا کیوں ہے۔ وہ بصیرت افروز باتیں جو ہم نے آگے اس باب میں پڑھی تھیں وہ کہاں گئیں۔ اور یہ نئے نئے بیان اس میں کب اور کیسے شامل ہو گئے۔

جب ہم نے اس ترجمہ کا دیباچہ پڑھا تب ہم پر حقیقت حال روشن ہوئی۔ مترجم میاں طفیل محمد ہیں، دیباچہ میں تحریر فرماتے ہیں۔'' میں نے پوری کوشش کی ہے کہ مصنف بزرگوار کی استفادہ عام کی کوئی بات رہ نہ جائے اور نہ کوئی بات اپنے اصل مفہوم سے ہٹنے پائے۔ البتہ خاص فلسفیانہ بحثوں اور مسائل کی صوفیانہ توجیہات کو میں نے چھوڑ دیا ہے جو پرانے اسلوب نگارش کا حصہ تو ہیں لیکن اصل مضمون اور مقصود بیان سے ان کا کوئی خاص تعلق نہیں۔ ان کے بجائے تین چیزوں کا میں نے اضافہ کیا ہے۔ ایک یہ کہ ان آیات اور حتی الامکان احادیث کے بھی حوالے دیدیئے ہیں جن کو حضرت علی ہجویری رحمہ اللہ نے اپنی بات کے ثبوت اور وضاحت میں پیش فرمایا ہے۔ دوسرے جہاں مجھے ان آیات واحادیث اور اقوال کے علاوہ اسی مضمون کی کوئی اور آیات حدیث یا قول ملے ہیں تو انھیں بھی میں نے شامل کر دیا ہے تا کہ اصل مضمون زیادہ سے زیادہ خوبی اور مضبوط دلائل کے ساتھ ادا ہو جائے''۔ اس بیان کی روشنی میں میاں طفیل محمد صاحب کی مینا کاری کی چند مثالیں ملاحظہ فرمائیے۔ شروع کتاب میں داتا صاحب رحمہ اللہ نے بتایا ہے' کہ انھوں نے استخارہ کیا اور اس کے بعد اس کتاب کا آغاز کیا۔ پھر انہوں نے استخارے کے باب میں کچھ باتیں کہی ہیں۔ میاں طفیل محمد صاحب نے اس پورے بیان میں اس طور کتر بیونت کی ہے کہ استخارے کا تذکرہ

یکسر غائب ہوگیا۔ مگر جو باتیں انھوں نے کہی ہیں وہ تو سب استخارے کی بحث میں کہی ہیں۔ اس لئے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس پورے بیان کے ساتھ میاں طفیل محمد کو کیا سلوک کرنا پڑا ہوگا۔ کشف المحجوب کے مختلف مباحث میں میاں طفیل محمد صاحب نے داتا صاحب رحمہ اللہ کے بیان کو ناکافی سمجھا اور اپنی طرف سے اس میں اضافے کئے مگر ایسے بیان بھی ہیں جنہیں انہوں نے کافی سے زیادہ سمجھا اور اس میں تخفیف کرتے چلے گئے۔ مثلاً جس بیان میں ایک حدیث درج کی گئی ہے، اس میں دو تین اور احادیث درج کردی گئیں اور اپنی طرف سے کچھ عبارت بھی شامل کردی گئی مگر کسی بیان میں اگر چار حدیثیں درج نظر آئیں تو اس میں سے تین حذف کردیں۔ اور ایک رہنے دی۔ مثلاً ایک باب میں چپ رہنے اور بولنے کے آداب سے متعلق ہے۔ میاں طفیل محمد احادیث کو اور مختلف صوفیا کے اقوال کو جو اس میں درج تھے حذف کرتے چلے گئے ہیں۔ اور داتا صاحب رحمہ اللہ کے بیان میں بھی اچھا خاصا تغیر وتبدل کیا ہے۔ حالانکہ یہ ایسا باب ہے کہ خود میاں طفیل محمد اس کے مطالعہ سے چپ رہنے اور بولنے کے بہت سے قیمتی آداب سیکھ سکتے تھے۔

اسی باب میں داتا صاحب رحمہ اللہ نے یہ فرمارکھا ہے کہ ''مرید کو چاہئے کہ رہنماؤں کے کلام میں دخل نہ دے اور اس میں کچھ تصرف نہ کرے اور پریشان اور اُوپری عبارت استعمال نہ کرے''۔ میاں طفیل محمد صاحب نے کم ازکم اس بیان کو حذف نہیں کیا ہے مگر اس پر دھیان بھی نہیں دیا۔ انھوں نے شیخ علی ہجویری رحمہ اللہ کے کلام میں دخل بھی دیا ہے۔ اور اس میں تصرف بھی کیا۔ اور اس میں پریشان اور اوپری عبارت بھی داخل کی ہے۔ پس زیر بحث ترجمہ کا متن مترجم کی اس رَوش کے باعث ناقابل اعتبار ہوگیا ہے۔ اس میں یہ پتہ نہیں چلتا کہ کتنی بات داتا صاحب رحمہ اللہ نے کہی ہے اور کتنی بات اس میں میاں صاحب نے شامل کردی ہے۔ اپنی طرف سے تو میاں صاحب نے داتا صاحب رحمہ اللہ پر احسان ہی کیا ہے۔ کیونکہ ان کے خیال میں داتا صاحب رحمہ اللہ جا بجا مضمون کو خوبی اور مضبوط دلائل کے ساتھ ادا نہیں کرسکے ہیں پس انہوں نے داتا صاحب رحمہ اللہ کو سہارا دیا ہے۔ اور ان کے کمزور بیان کو مضبوط بنایا ہے۔ میاں طفیل محمد کو یہ زعم مبارک رہے۔ مگر پڑھے لکھے آدمی ہوکر انہیں اتنی معمولی بات تو معلوم ہونی چاہئے کہ کسی مصنف کے بیان پر اگر کوئی اعتراض مقصود ہو یا اس میں تصحیح یا اضافے کی ضرورت محسوس کی جائے تو وہ حاشیے میں کی جاتی ہے۔ مصنف کے ساتھ وہ سلوک نہیں کیا جاتا جو سکول ماسٹر طلبا کی کاپیوں کے ساتھ کرتا ہے۔ کہ اس کی عبارت میں کاٹ پیٹ کرتے چلے گئے۔ جہاں جی چاہا فقرہ کاٹ دیا۔ جہاں جی چاہا فقرے اضافہ کردیئے۔ علمی دنیا میں اسے امانت میں خیانت کہتے ہیں۔

(ہفت روزہ الفتح، 6 تا 13 مئی 1971)

محمد علی جناح اور ویمبلڈن کی مسجد

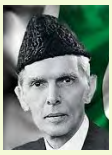

انعام الحق

ہماری نئی نسل سمیت کئی پاکستان کا نام لینے والے اس بات سے واقف نہیں کہ قائداعظم محمد علی جناح ہندوستان کے مسلمانوں کی زندگی سنوارنے کا عزم اُٹھانے کے بعد ہندوستان کی سیاست چھوڑ کر کیوں چلے گئے تھے اور جانے کے بعد واپس کیسے آگئے۔ جیسے پانچ انگلیاں برابر نہیں ہوتیں ویسے مسلمانوں میں سارے ہی مومن نہیں ہوتے۔ ہندوستان کے مسلمانوں میں جنہیں دولت کی لالچ تھی وہ ہندوؤں سے روپے لے کر منافقت پھیلا رہے تھے اور عوام کے گروح کو اکٹھا کر کے الگ ملک کے خلاف مسلمانوں میں زہر اُگل رہے تھے۔ مسلمان بھی کسی حد تک اُس وقت کے لالچیوں کے بچھائے جال میں آرہے تھے اور محمد علی جناح اور الگ ملک کے خلاف اندر ہی اندر دشمن پیدا کررہے تھے۔ اُن میں وہ لوگ بھی شامل تھے جو پاکستان بننے سے پہلے قائداعظم کو کافر اعظم اور پاکستان کو پلیدستان بھی کہتے تھے اس کے علاوہ اُنکا یہ بھی کہنا تھا کہ، پاکستان تو دور کی بات ہم پاکستان کی پ بھی نہیں بننے دیں گے،۔ خیر قائداعظم کے ہندوستان کی سیاست چھوڑ جانے سے مسلمانان ہند ایک عظیم لیڈر کی سیاست سے محروم ہو گئے تھے۔ لیکن ہندوستان میں بعض دردمند ایسے بھی تھے جو صدق دل سے یہ سمجھتے تھے کہ مسلمانانِ ہند کی قسمت سنوارنے کی اہلیت رکھنے والا رہنما مایوس ہوکر کیوں چلا گیا؟ اس کو واپس لانا چاہئے۔ تاریخ کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اُن دردمندوں میں سرفہرست مرزا بشیر الدین محمود احمد کی شخصیت تھی۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ قائداعظم ہندوستانی سیاست میں واپس آئیں اور مسلمانانِ ہند کی قسمت سنوارنے کا جو عزم اُن کے دل میں ہے اُسے تکمیل تک پہنچائیں۔ خیر مرزا بشیر الدین نے اپنے ایک قریبی اور بااعتماد شخص مولانا عبدالرحیم درد کو اس مقصد کے لئے منتخب کیا اور انگلستان روانہ کیا تاکہ وہ قائداعظم سے بات کرے اور اُنہیں ہندوستان کی سیاست میں واپس آنے پر آمادہ کرتے۔ 23 مارچ 1932 کو مولانا عبدالرحیم لندن گئے اور قائداعظم سے متعدد ملاقاتیں کی۔ قائداعظم نے اُنہیں اپنی بہت سی مجبوریاں پیش کیں مگر اپنی آخری ملاقات میں جو تین گھنٹے تک جاری رہی مولانا عبدالرحیم کی تلقین اور مدلل طریق کے نتیجہ میں محمد علی جناح پھر میدان سیاست میں آنے پر آمادہ ہوگئے اور یہ قرار پایا کہ اس غرض سے محمد علی جناح 16 اپریل 1933 کو ویمبلڈن کی مسجد فضل لندن میں عیدالاضحیٰ کے موقع پر، ہندوستان کے مستقبل، کے متعلق تقریر کریں گے نیز اس تقریر کا سارا انتظام اور نشر واشاعت کا اہتمام مولانا الرحیم خود کریں گے، مولانا اُس وقت فضل مسجد

لندن کے امام بھی تھے۔ یہ تقریب بڑی دُھوم دھام سے منائی گئی اور ہر مکتبہء فکر کے ذی اثر لوگوں نے شرکت کی۔ انگلستان کے تمام مشہور اخبارات میں اس تقریر کا بہت چرچا ہوا۔ تقریر کی ابتداء میں قائداعظم نے کہا، امام، مسجد فضل، لندن نے ترغیب دی اور اس ترغیب میں اُن کی فصاحت وبلاغت نے میرے لئے کوئی راہ فرار نہیں چھوڑی۔ اُن کی پُرزور تحریک کی وجہ سے میں اس سیاسی اسٹیج پر کھڑا ہونے کے لئے مجبور ہوں، چنانچہ سنڈے ٹائمز لندن نے اپنی اشاعت 9 اپریل 1933ء میں لکھا، ترجمہ: میلوز روڈ ویمبلڈن کی مسجد کے میدان میں ایک اور بڑا اجتماع منعقد ہوا جدھر ممتاز ہندوستانی مسلم رہنما محمد علی جناح نے ہندوستان کے مستقبل پر خطاب کیا اور اپنے خطاب میں انڈین وائٹ پیپرز پر قومی نقطہ نظر سے تحفظات کا اظہار کیا۔ صدر اجلاس سر اسٹیورٹ سنڈیمن ایم پی نے اس موضوع پر مسٹر چرچل کا مؤقف اختیار کیا جس پر بعض حاضر مسلم طلبا نے کچھ تلخ مظاہرہ کیا مگر مولانا عبدالرحیم درد نے اُنہیں رام کرلیا۔ یہ تقریر پریس کی خاص توجہ کا مرکز بن گئی اور اس سے متعلق درج ذیل اخبارات نے تبصرے بھی شائع کئے۔ ماڈرن میل، ہندو مدراس، ایوننگ سٹینڈرڈ، ایجپٹین گزٹ الیگزنڈرا، ویسٹ افریقہ، سٹیٹس مین کولکتا، سنڈے ٹائمز لندن۔ اس کے بعد قائداعظم نے انگلستان کو خیر باد کہہ دیا اور پھر ہندوستان واپس آگئے اور نئے جوش اور ولولہ سے تحریک پاکستان کا آغاز کیا جس کے نتیجے میں 1947ء میں پاکستان معرض وجود میں آیا۔ قائداعظم محمد علی جناح سے متعلق اور بہت سے تحقیقات اور یادیں وابستہ اور پوشیدہ ہیں جنہیں عوام الناس اور محمد علی جناح کے عاشقوں کے سامنے لانا ضروری ہے۔ خاکسار اس حوالے سے کوشش جاری رکھے گا کہ قائداعظم کی زندگی سے متعلق پوشیدہ حقائق سامنے لاتا رہے۔

کلام مرزا غالب

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستا کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور

مٹ جائے گا سر، گر ترا پتھر نہ گھسے گا
ہوں در پہ ترے ناصیہ فرسا کوئی دن اور

آئے ہو کل، اور آج ہی کہتے ہو کہ جاؤں
مانا کہ ہمیشہ نہیں، اچھا، کوئی دن اور

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے
کیا خوب، قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

ہاں اے فلکِ پیر، جواں تھا ابھی عارف
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

تم ماہِ شبِ چار دہم تھے مرے گھر کے
پھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشا کوئی دن اور

تم کون سے تھے ایسے کھرے داد و ستد کے!
کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور

مجھ سے تمھیں نفرت سہی، نیر سے لڑائی
بچوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور

گزری نہ، بہ ہر حال، یہ مدت خوش و ناخوش
کرنا تھا جواں مرگ! گزارا کوئی دن اور

ناداں ہو جو کہتے ہو کہ کیوں جیتے ہیں غالب
قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور

روشنی دینے والی مخلوق

زکریا ورک
(ٹورنٹو کینیڈا)

بہت سی مخلوقات نائٹ لائف میں تجربہ رکھتے ہیں یا پھر وہ تاریکی میں رہنا پسند کرتے ہیں کیونکہ وہ خود اپنے لئے روشنی پیدا کرتے ہیں۔ روشنی پیدا کرنا بہت سارے آرگنا ازم، کیڑوں، اور مچھلی میں دیکھا جا سکتا ہے۔ روشنی پیدا کرنا اعلیٰ مخلوقات میں مفقود ہے۔ روشنی پیدا کرنے کا مقصد بعض مخلوقات میں سیکس پارٹنر کو پیغام رسانی کرنا، اور بعض دفعہ اس کا مقصد کیڑوں کو اپنے شکنجے میں لے کر ہڑپ کر جانا ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں جنگو firefly or lightbug کو دنیا کا کامیاب کیڑا مانا جاتا ہے جو دھوکے فراڈ کا ماہر سمجھا جاتا ہے۔ مونث جگنو میں ان کے پیٹ کے کونے پر ٹیل لائٹ لگی ہوتی ہے جس کو وہ آن آف کر سکتی ہے۔ اس روشنی کا مقصد مذکر جگنوؤں کو اپنے محل وقوع اور دیگر پیغامات بھیجنا ہوتا ہے۔ دیگر مخلوق کے ساتھ بھی یہ فلیش لائٹس کے ذریعہ پیغام رسانی کرتے ہیں جس کا واحد مقصد ان کو دام تذویر میں لا کر خود کو غذا مہیا کرنا ہوتا ہے۔ جگنو کی روشنی فریب، دھوکہ اور عیاری کی اعلیٰ مثال ہے۔ یہ روشنی نصف انچ کے برابر ہوتی جو کہ کافی فاصلے تک دیکھی جا سکتی ہے۔ جگنو رات کے وقت یا پھر غروب آفتاب کے وقت نظر آتے ہیں۔ دن کے وقت یہ سست اور کاہل ہوتے مگر رات کے وقت یہ فلیش لائیٹس کا زبردست شوپیش کرتے ہیں۔ جگنو کی دونوں جنس اور لاروا روشنی پیدا کر سکتے ہیں۔ کیریبین جزائر میں تو لوگ رات کی وقت جگنوؤں کو سوتی پٹی میں ڈال کر سر پر ڈیکوریشن کے طور پر باندھ لیتے جس سے رات کے وقت عجب سماں پیدا ہوتا ہے۔ موسم گرما میں جھاڑیوں میں اکثر جگنو جمع ہو جاتے تو وہ شام ڈھلے فلیش لائٹ کے ذریعہ مخفی پیغام بھیجتے جس کو دوسرے جگنو سمجھ پاتے ہیں۔ مؤنث جگنو کا پیغام مذکر جگنو سے مختلف ہوتا ہے۔ ان کی ٹیل لائٹ سے پہلے سے طے شدہ کوڈیڈ میسج coded message نکلتا ہے جس کو مؤنث شناخت کر لیتی ہے۔ اگر اس پیغام کا مذکر جواب دے تو وہ بجائے جنسی ملاپ کے جلد ہی ہڑپ کر لیا جاتا ہے۔ مذکر کی پہچان اس کے بھیجے ہوئے فلیشز کے عرصہ، فری کوئینسی اور ان کی تعداد سے ہوتا ہے۔ جزائر فلپائین کے شہر Donsol میں جگنو پورے سال دیکھے جا سکتے ہیں۔ امریکہ کی ریاست ٹینے سی کے شہر Elkmont ہر سال جون کے پہلے ہفتہ میں جگنو ایک ساتھ میں روشنی فلیش کرتے نظر آتے ہیں۔ ساؤتھ کیرولائنا کے کونگاری نیشنل پارک میں جگنو وافر تعداد میں نظر آتے ہیں۔ کینیڈا کے شہر کنگسٹن میں راقم الحروف نے Lemoine Point park میں شام ڈھلے جھاڑیوں میں جھیل اونٹاریو کے کنارے لاتعداد جگنوؤں کی پرواز کئی سال تک دیکھی ہے۔ سائنسدانوں نے تجربہ میں دیکھا ہے کہ اگر فلیش لائٹ کی مصنوعی روشنی جگنوؤں کی طرف ایک منٹ کیلئے بھیجی جائے تو مذکر جگنو فوراً اس کی طرف پرواز کر کے چلا جاتا ہے۔ جگنوؤں کی مختلف انواع دنیا میں پائی جاتی ہیں۔ جیکا کا فائر فلائی Photinus pallens دو قسم کے سگنل فلیش کرتا ہے۔ جب وہ کسی جگہہ پر بیٹھا ہوتا، تو وہ برائٹ لائٹ

فلیش کرتا جس کی مدت نصف سیکنڈ کی ہوتی، مگر جب یہ پرواز میں ہوتا تو لائٹ فلیشز غیر معینہ مدت پر آتے، اور اتنے چمکدار ہوتے کہ انسان چندھیا جاتا ہے۔ جگنو کی نارتھ امریکہ کی نوع تنہائی پسند ہوتی جو اکیلے ہی پرواز میں مؤنث کی تلاش میں مگن رہتی ہے۔ تھائی لینڈ میں صدیوں جگنو 3-2 سیکنڈ میں موافقت میں دریا کے کنارے پر فلیش کرتے نظر آتے ہیں۔ نیوگنی کے جگنو نصف سیکنڈ میں فلیش کرتے ہیں۔ بعض انواع ہر تین سیکنڈ میں فلیش کرتے ہیں۔ بعض جگہوں پر دیکھا گیا کہ ایک درخت پر بیٹھے درجنوں جگنو ایک ہی وقت میں اکٹھے فلیش کرتے جبکہ دوسرے درخت پر بیٹھے جگنو پہلے درخت سے مختلف وقت فلیش کر رہے تھے۔ یہ synchronize کیوں کرتے ہیں اس کا جواب ابھی نہیں ملا۔ جگنو کی روشنی لکڑی، تیل یا کوئلے کی روشنی کی نسبت سو فی صد روشنی ہوتی جس سے کوئی حرارت پیدا نہیں ہوتی۔ نارتھ امریکہ کے فائرفلائی میں سے سبز روشنی نکلتی، مگر بعض انواع میں دو قسم کی روشنی نکلتی ہے۔ برموڈا کے جزیرہ کے فائرفلائی کی سیکس لائف چاند کے مراحل سے مطابقت رکھتی ہے۔ پورے چاند کے دو یا تین روز بعد، مؤنث جگنوؤں کے جھنڈ پانی کی سطح پر جمع ہو جاتے اور گرین لائٹ پیدا کرتے ہوئے دائرے میں تیرتے ہیں۔

روشنی دینے والی مچھلی

مچھلی کی بہت ساری انواع روشنی دینے کی اہلیت رکھتی ہیں۔ فلیش لائٹ فش کے روشنی دینے کا مقصد پیغامات بھیجنا وصول کرنا، شکار کو دام میں لانا، شکار خود مچھلیوں سے خود کو محفوظ رکھنا اور چیزوں کو بہتر طریق سے دیکھنا ہوتا ہے۔ مچھلی کی چار اقسام میں ان کے ہر آنکھ کے نیچے روشنی دینے کا عضو لگا ہوتا جس سے فلیش لائٹ کے برابر کی روشنی خارج ہوتی ہے۔ ایسی مچھلیاں زیادہ نظر نہیں آتیں کیونکہ یہ سائز میں چھوٹی اور گہرے پانی میں رہنا پسند کرتیں۔ فلیش لائٹ فش کے روشنی دینے والے عضو پر تاریک پردہ لگا ہوتا جس سے یہ خود ہی چندھیا نے نہیں پاتی۔ تجربہ گاہ میں جب روشنی دینے والا عضو الگ کیا گیا تو یہ آٹھ گھنٹے تک چمکتا رہا۔ مچھلی جب اس لائٹ کو بجھانا چاہتی تو یہ عضو کے اوپر تاریک پردہ ڈال دیتی ہے۔ اور اگر شکار کرنے والے جانور قریب آئے تو یہ لائٹ آن کر لیتی جس سے اس کو راہ فرار مل جاتا۔ فلیش لائٹ فش ایک منٹ میں تین دفعہ جھپکنے کی اہلیت رکھتی ہے۔ وہ بیکٹیریا جو یہ روشنی پیدا کرتا اس کو تجربہ گاہ میں بنانے کی کوشش ناکام رہ چکی ہے۔ انڈونیشیا کے بانڈا جزیرہ کے فشرمین دیکھ چکے ہیں کہ فلیش لائٹ فش روشنی شکار کو پھنسانے کیلئے استعمال کرتی ہے۔ برموڈہ کے جزیرہ کے fireworms روشنی کو نسلی افزائش کیلئے استعمال کرتے ہیں۔

انسان اور روشنی

انسانوں میں بھی بعض اولیاء اور نیک فرشتہ سیرت انسان ایسے ہوتے جن کے چہرے بشرے سے روشنی نظر آتی ہے۔ ان کے گرد ہالہ نور ہوتا جس کو صرف نیک خصلت لوگ ہی دیکھ سکتے ہیں۔ جو انسان دوسروں کیلئے راہ نما ہوتے ان کو مینارہ نور سے تشبیہ دی جاتی ہے۔

عاشق انسانیت

اے حق۔ لندن

گذشتہ دِنوں دُنیا ایک ایسے اُستاد سے محروم ہوگئی جو انتہائی سادہ، بھولا بھالا، ظاہری زیبائش سے پاک، راست باز، سیدھا سادھا محب وطن اور عاشقِ انسانیت تھا۔ وہ اپنے ملک پاکستان اور پاکستانی قوم سے بے پناہ عشق کرتا تھا۔ اُس اُستاد کی تمام خصوصیات کو دیکھتے ہوئے پاکستان سے باہر کی دُنیا بھی اُسے انسانیت سیکھانے والے اُستاد کے نام سے جانتی تھی۔ نہ صرف پاکستان میں بلکہ پاکستان سے باہر اُسے کئی ایوارڈز سے نوازا گیا اور کئی ایسے ایوارڈز تھے جن کے بارے میں اُس عاجز انسان کا یہ کہنا تھا کہ ''ایوارڈ وغیرہ میرے کس کام کے؟'' اُسکی سادگی اور عاجزی زبان زدِ عام تھی۔ وہ شخص جس کا نام عبدالستار ایدھی تھا گذشتہ دنوں ہمیں چھوڑ گیا۔ لیکن جاتے جاتے بھی انسانیت کی خدمت سے باز نہ آیا اور اپنے جسم تک انسانیت کی خدمت کے لئے پیش کر دیا۔ عبدالستار ایدھی جیسی شخصیت سے کون نہ ملنا چاہے گا؟ میری ایدھی صاحب سے کئی بار ملاقات ہوئی اور وہ ملاقاتیں ہمیشہ کیلئے مجھے نہ صرف یاد رہیں گی بلکہ میں نے اُن مُلاقاتوں سے وہ سبق سیکھے ہیں جو میری زندگی میں میرے کام آرہے ہیں۔ میں اپنی زندگی میں بڑی بڑی شخصیات سے ملا ہوں جن میں ایسے اُمراء بھی شامل ہیں جنہیں بولنے اور اپنا آپ بتانے کا بہت شوق ہے۔ بڑے بڑے سیاستدانوں اور حکومتِ وقت چلانے والے اہم احباب سے بھی ملاقاتیں کی ہیں۔ لیکن میں نے کسی بھی شخصیت کو عبدالستار ایدھی صاحب جیسا عاشقِ انسانیت نہیں پایا۔ میں نے جب اُن سے دوسری ملاقات میں انٹرویو کیا اور پاکستان کے مسائل جن میں چوری چکاری، رشوت خوری، لوٹ مار، شہریوں کے مسائل جن میں ڈاکے، ریپ، فراڈ، راہ زنی کی وارداتیں اور بے شمار ایسے جرائم ہیں جن سے انسانیت پریشان ہے، کا ذکر کیا تو ایدھی صاحب نے ہر مسئلے کا ایک ہی حل یہ بتایا ہے ''انسان انسان کی قدر کرے، بُرا انسان اچھائی کی طرف آئے اور اچھا انسان بننے کی کوشش کرے، ہر ایک انسان کو چاہئے کہ جو اللہ تعالیٰ نے ہمارے ذمے فرائض لگائے ہیں اُنہیں اچھے طریقے سے ادا کریں۔

ہم سب کو چاہئے کہ سب سے پہلے اچھا انسان بنیں اور ملک وقوم کی خدمت کریں۔''

میں ذاتی طور پر یہ سمجھتا ہوں کہ عبدالستار ایدھی صاحب کی خدمت، کا خلوص، کی نیت اور اُنکی انسانیت سے محبت کا اگر ہم دن رات صبح شام بھی ذکر کریں اور اُنہیں خراجِ تحسین سے خراجِ عقیدت تک اور جو کُچھ ہم اُن کی شان میں ہم بیان کر سکتے ہیں چاہے کر لیں لیکن ہم میں سے کوئی ایک بھی اُنکی خدمت کا رتی بھر بھی ادا نہیں کر سکتا۔ میری عبدالستار ایدھی صاحب کیلئے دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اُنہیں جنت میں اعلیٰ مقام عطاء فرمائے، اُنکے درجات بلند فرمائے، اُنکے اہل وعیال کو اپنے خاصل فضل اور رحم سے اپنی حفاظت میں رکھے اور صبر جمیل عطاء فرمائے، ایدھی صاحب کا نام دُنیا میں ''عاشقِ انسانیت'' کے نام سے تادیر جانا جائے۔ اللہ تعالیٰ اُنکی تمام نیک خواہشات کو پورا فرمائے اور اللہ تعالیٰ اپنے فضلوں کی بارش اُن بچوں پر فرمائے جنہیں ایدھی صاحب نے اپنی ذمہ داری سمجھا اور اُنکی پرورش کی کوشش کی۔ آمین

انشائیہ

انتظار

امجد مرزا امجد

انتظار کا نام لیں تو کسی عاشق کا تصور ذہن میں آتا ہے۔ جو شیو بڑھائے ہڈیوں کے ڈھانچہ بنا آنکھوں میں غم و یاس کے سمندر سجائے میلے کچیلے کپڑوں کے ساتھ کسی ٹنڈ مُنڈ درخت کے ساتھ جس کے اوپر دو تین گدھ اس کے مرنے اور سوکھا ہوا گوشت نوچنے کے انتظار میں بیٹھے ہوں۔ مگر یہ صرف شاعری کی حد تک ہے اور وہ بھی پچھلی صدی کی، آجکل تو ایک ایک منٹ قیمتی ہے لوگوں کا۔ محبوبہ زیادہ سے زیادہ پانچ منٹ انتظار کرتی ہے ورنہ فوراً اپنا موبائیل فون نکال کر کسی اور کو فون کرے گی۔ ''ہیلو آصف! تم نے پرسوں کہا تھا نا فلم کے لئے تو پانچ منٹ میں آجاؤ میں اوڈین کے سامنے انتظار کر رہی ہوں۔'' سب سے مشکل انتظار اس قیدی کا ہے جسے موت کی سزا کا حکم سنایا گیا ہو۔ کوئی اس سے پوچھے کہ انتظار کیا ہوتا ہے۔

یا پھر اس مریض سے انتظار کی کیفیت پوچھی جائے جسے ڈاکٹر یہ بتا دے کہ تم اب کچھ ہی دنوں کے مہمان ہو۔ وہ ایک ایک دن کتنی صدیاں اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہوگا انتظار کی بے تابی اس میزبان کو بھی ہوتی ہے جس کے گھر مہمان اپنے چھ بچوں کے ساتھ دس دن سے براجمان ہو۔ اور روز کہہ دیتا ہو کہ ہم جلد ہی واپس چلے جائیں گے ۔مومن کے لئے جنت کا انتظار۔ اور دنیا کے قید خانے سے چُھٹ کر ہمیشہ کے لئے حوروں کی گود اور دودھ و شہد کی نہروں میں غوطے لگانے کا انتظار، عاشق کو معشوق کے وصال کا انتظار، ماں کو پردیس گئے ہوئے بیٹے کی واپسی کا انتظار، نئی بیاتا بیوی کو اپنے میاں کی چھٹی کا انتظار، جنگ پر گئے ہوئے جوان بیٹے کا ماں باپ کو انتظار، بہن کو بھائی کے ملنے کا انتظار صرف وہی لوگ جانتے ہیں جو اس کرب سے گذر رہے ہوں۔ انتظار وہ نشہ ہے کہ منتظر چھت پر بیٹھ کر راہ دیکھتا رہتا ہے۔ رات کو دیوار پر دیوے جلا کر رات آنکھوں میں گذار دیتا ہے۔

ہماری شاعری بھی انتظار کی مرہونِ منت ہے اگر انتظار کا کرب نہ ہوتا تو زندگی بڑی بے لطف ہوجاتی۔ ہمارے بزرگ تو اچھے دنوں کے انتظار میں ساری ساری عمر کاٹ دیتے تھے۔ مگر آج کل ہر کوئی اسی کوشش میں ہے کہ انتظار کی تکلیف نہ سہنی پڑے، راتوں رات لکھ پتی ہوجائیں اور جو چاہیں وہ حاصل ہوجائے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی بھی اسی کوشش میں ایسی ایسی ایجادات کر رہی ہے کہ انسان کو بٹن دباتے ہی مطلوبہ چیز میسّر ہوجائے اور وہ انتظار کی تکلیف نہ برداشت کرے۔

مگر جوں جوں انتظار کی قوّت ہم میں کم ہو رہی ہے نفسا نفسی، خودغرضی اور اعصابی تناؤ بڑھتا جا رہا ہے۔ ایک زمانہ تھا ہمیں نئے جوتے کے لئے عید کا انتظار کرنا پڑتا تھا جو سال کے بعد آتی تھی۔ جس موچی کے پاس جا کر ناپ دیا جاتا تھا اسے ہر روز سکول سے واپسی پر سلام کیا کرتے تھے۔ وہ بھی چمڑے کا ایک ٹکڑا دِکھا کر خوش کر دیتا تھا کہ دیکھو میں اس پر کام کر رہا ہوں۔ مگر آج جوتا ذرا سا گندہ بھی ہوجائے تو بیٹا سکول نہیں جاتا، جب تک کہ اسے نیا جوتا نہ لے کر دیں۔ بچپن سے ہی اسے انتظار کی لذّت سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ آج کل تو گلی میں ریڑھی والا بھی انتظار نہیں کرتا ،آواز دیتا چلا جاتا ہے۔ دوکاندار گاہک کو جیب سے پیسے نکالنے کا بھی وقت نہیں دیتا اور کہہ دیتا ہے مال لینا ہے تو پیسے ہاتھ میں رکھو۔ ورنہ اگلی دوکان پہ چلے جاؤ۔ لوگ منگنیاں تو کیا کئے ہوئے نکاح توڑ دیتے ہیں کہ ہم اتنی دیر انتظار نہیں کر سکتے۔ شادی کے بعد بیوی کی گود ہری نہ ہو تو چند سال بھی انتظار نہیں کیا جاتا بلکہ دوسرے سال ہی لڑکے کی ماں برادری میں دوسرا رشتہ ڈھونڈنے لگتی ہے۔ انتظار صبر کا دوسرا نام ہے۔ اور صبر کرنے والوں کے لئے تو اللہ نے بھی انعام اکرام کا وعدہ کیا ہے۔ اس دنیا میں بھی اور اُس دنیا میں بھی۔ مگر ہم انتظار یا صبر اپنی مجبوری کی حالت ہی میں کرتے ہیں ۔جب کہ کوئی اور چارہ نہ ہو۔ ورنہ۔ کئی مہربان تو مار پٹائی پہ اُتر آتے ہیں۔ جس نے کبھی انتظار نہیں کیا اس نے کیا دنیا دیکھی یا اسے کسی لذّت کا کیا احساس۔ اور جس کا کسی نے کبھی انتظار نہیں کیا اس کا جینا بھی کوئی جینا ہے۔ کیونکہ مردہ انسان کا انتظار نہیں کیا جاتا اسے فوراً دفن کر دیا جاتا ہے۔

ہزاروں خواہشیں ایسی...

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ، ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان، لیکن پھر بھی کم نکلے

ڈرے کیوں میرا قاتل کیا رہے گا اُس کی گردن پر
وہ خوں، جو چشمِ تر سے، عمر بھر یوں دم بہ دم نکلے

نکلنا خُلد سے آدم کا سُنتے آئے ہیں، لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

مگر لکھوائے کوئی اس کو خط، تو ہم سے لکھوائے
ہوئی صبح، اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے

ہوئی جن سے توقع، خستگی کی داد پانے کی
وہ ہم سے بھی زیادہ خستۂ تیغِ ستم نکلے

محبت میں نہیں ہے فرق، جینے اور مرنے کا
اُسی کو دیکھ کر جیتے ہیں، جس کافر پہ دم نکلے

کہاں میخانہ کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ!
پر اِتنا جانتے ہیں، کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

اُردو اَدب کی موزوں شخصیات جسے پاکستان نے قبول نہ کیا

جمود کی مخالفت نہ کرو، اسے فروغ دو کیونکہ یہی کامیابی کی کنجی ہے

رانا عبدالرزاق خان لندن

اردو ادب کے عظیم ناول آگ کا دریا کی مصنفہ قرۃ العین حیدر 1949ء میں پاکستان آئیں اس وقت انہوں نے عالمی سطح کی ایک لکھاری کا درجہ حاصل کرلیا تھا۔ انہوں نے محکمہ اطلاعات میں ملازمت اختیار کی اور کچھ عرصہ تک خدمات سرانجام دیں۔ 1959ء میں ان کا عظیم ناول آگ کا دریا شائع ہوا جس میں تقسیم کے متعلق کئی اہم سوالات اٹھائے گئے اور دوقومی نظریہ کو مسترد کیا گیا تھا۔ کسی اور بات کے مقابلے میں یہی وہ بات تھی جس کی وجہ سے پاکستان میں مزید قیام امن ان کے لئے ناممکن ہو گیا، اس لئے وہ بھارت روانہ ہوگئیں اور وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ اردو زبان کے نفیس ترین رومانی شاعر ساحر لدھیانوی 1943ء سے لاہور میں سکونت اختیار کئے ہوئے تھے جہاں انہوں نے کئی ادبی جریدوں کے لئے کام کیا۔ تقسیم تک حالات بالکل ٹھیک ہی تھے کہ سویرا نامی میگزین میں ان کی شعلہ بیانی تحاریر (اشتراکی خیالات کی نظریات) شائع ہونے کی وجہ سے ان کے خلاف حکومت پاکستان نے وارنٹ جاری کر دیا۔ 1949ء میں ساحر بھارت روانہ ہوگئے اور پھر کبھی پیچھے مڑ کر نہ دیکھا۔ معروف ترقی پسند نظریات کے حامی اور انقلابی شخصیت سجاد ظہیر تقسیم کے بعد پاکستان آئے لیکن انہیں راولپنڈی سازش کیس میں شامل کرلیا گیا اور 1954ء میں انہیں پاکستان بدر کرکے بھارت بھیج دیا گیا۔

اُستاد بڑے غلام علی خان پاکستانی شہری تھے۔ انہیں برصغیر کا عظیم کلاسیکی گلوکار سمجھا جاتا تھا وہ اپنی جانب روا رکھی جانے والی لاتعلقی اور بے حسی سے اس قدر مایوس ہوئے کہ انہوں نے مستقل بھارتی شہریت کے لئے درخواست دے دی جون 1957ء میں منظور ہوئی اور بھارت ہجرت کر گئے اس کے بعد خوشحال رہے۔ یہ وہ تمام شخصیات ہیں جنہوں نے بھارت میں خوشحال اور پرسکون زندگی گذاری اور انہیں بھارتی حکومت کی جانب سے کئی قومی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ چلیں اب دیکھتے ہیں کہ سرحد پار پاکستان میں معاملات کیا رہے۔ معروف افسانہ نگار سعادت حسن منٹو 1947ء کے بعد پاکستان ہجرت کر کے آئے۔ یہاں اُن پر تین مرتبہ اپنی تحریر میں فحش نگاری کی وجہ سے مقدمہ دائر کیا گیا۔ مایوس اور غربت کا شکار سعادت 42 سال کی عمر میں انتقال کر گئے 14 اگست 2012ء کو حکومت پاکستان نے منٹو کو اپنے اعلیٰ ترین سول اعزاز نشان امتیاز سے نوازا اور وہ بھی ان کی موت کے 57 سال بعد۔ مارکسی نظریات کے بانی اور فلم ڈائریکٹر ضیاء سرحدی جنہوں نے ہمیں فٹ پاتھ اور ہم لوگ جیسی یادگار فلموں کا تحفہ دیا جب پاکستان سے ہجرت کر گئے تو وہ ممبئی میں ایک بہت

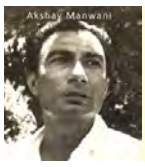

بڑی شخصیت بن کر اُبھرے۔ ان کی پہلی فلم رہگزر پاکستان میں ان کی آخری فلم ثابت ہوئی۔ جنرل ضیاء کے مارشل لاء کے دوران اُنہیں اٹھالیا گیا۔ اور قید تنہائی میں سخت اذیت میں رکھا گیا۔ ان پر مارکسی نظریات کے پرچار اور بغاوت کے الزامات عائد کئے گئے۔ رہائی کے بعد انہوں نے ہمیشہ کے لئے ملک چھوڑ دیا اور برطانیہ ہجرت کر گئے اور کبھی واپس نہیں آئے۔ رفیق غزنوی برصغیر کے انتہائی پرکشش با صلاحیت اور ہمہ گیر فنکار تھے وہ اداکار کمپوزر اور گلوکار بھی تھے انہوں نے ممبئی میں پنہر ملن، لیلیٰ مجنوں اور سکندر جیسی فلموں کے لئے موسیقی دی۔ تقسیم ہند کے بعد وہ کراچی آئے جہاں انہیں ریڈیو پاکستان میں معمولی ملازمت کی پیشکش ہوئی انہوں نے بعد میں استعفیٰ دے دیا اور باقی ماندہ زندگی تنہائی میں گذاری۔ اور 1974ء میں کراچی میں انتقال کیا۔ شیلا ارمانی 1950ء کی دہائی میں ریلیز ہونے والی دیوآنند کی فلموں ٹیکسی ڈرائیور اور نقوش کی ہیروئن تھیں۔

وہ سندھی تھیں اور وہ کراچی اپنے انکل لطیف کے پاس آئیں جو ایک پروڈیوسر تھے۔ انہوں نے پاکستانی فلم انوکھی میں مرکزی کردار ادا کیا جس میں مقبول گیت ''گاڑی کو چلانا بابو'' شامل تھا۔ تاہم کراچی میں سنیما کے محدود امکانات کو دیکھ کر وہ واپس بھارت چلی گئیں۔ سادہ لوح پنجابی شاعر اُستاد امن، جن کے لکھنے کا اپنا ہی ایک الگ انداز تھا۔ اپنے آزاد خیالات کی وجہ سے انہیں کئی مرتبہ جیل کی ہوا کھانی پڑی۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے انہیں بھارتی شہریت کی پیشکش کی لیکن انہوں نے مسترد کر دی۔ اس جرم کی پاداش میں انہیں جس انعام سے نوازا گیا وہ یہ تھا کہ ان کے ٹوٹے پھوٹے گھر سے ایک بم برآمد کیا گیا جس کی وجہ سے انہیں جیل بھیج دیا گیا یہ کام کسی او رکا نہیں بلکہ عوامی مقبول لیڈر ذوالفقار علی بھٹو نے کیا۔ برصغیر ہند کے ہمہ گیر گلوکاروں میں سے ایک محمد رفیع نے اگر پاکستان میں سکونت اختیار کرنے کا انتخاب کیا ہوتا تو سوچیں ان کی قسمت کیا ہوتی۔ شاید وہ لاہور کے علاقے بلال گنج میں نائی ہوتے اور اگر دلیپ کمار کے متعلق سوچیں تو پشاور کے قصہ خوانی میں خشک میوہ جات بیچ رہے ہوتے۔ استاد سلامت علی کو موسیقی کی دنیا میں بھگوان سمجھا جاتا ہے۔ اور اناڑی میں ان کا بہت نام تھا۔ لیکن پاکستان ہجرت کے بعد انہوں نے واہگہ میں اپنی پوری زندگی ایک میراثی کے طور پر گذاری۔ آخری مرتبہ جب اسلام آباد میں ایک کرائے کے مکان میں ان سے ملاقات ہوئی تو ان کی حالت بہت خراب تھی۔ ہمارے پاس استاد نصرت فتح علی خان بھی تھے اور جب وہ بھارت گئے تو انہیں زبردست پذیرائی ملی۔

بھارت میں ان کی ریکارڈ کی گئی موسیقی نے ایک ریکارڈ قائم کر دیا اور نہ صرف پاکستان اور بھارت بلکہ دنیا بھر میں ہٹ ثابت ہوئیں۔ راحت فتح علی خان، فاخر علی

ظفر، عاطف اسلم اکثر و بیشتر بھارت جاتے ہیں جہاں ایک ایسے معاشرے میں ان کے فن کو پذیرائی ملتی ہے جہاں فنون لطیفہ موسیقی روزمرہ کی زندگی کا حصہ ہے۔ عدنان سمیع نے بھی بھارتی شہریت لے لی ہے اور وہ مستقل وہیں رہتے ہیں۔ سلمیٰ آغا اور زیبا بختیار کو اُس وقت پذیرائی ملی جب انہوں نے بھارتی فلموں میں کام کیا اسی دوران وینا ملک کو جہاں یہاں جان سے مارنے کی دھمکیاں مل رہی ہیں اور وہ اُچھلتی پھر رہی ہیں موسیقار سہیل رانا اس قدر مایوس ہو گئے تھے کہ انہوں نے کینڈا میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ قبل ازیں نامور گلوکار سلیم رضا بھی کینڈا منتقل ہو چکے ہیں۔ مجھے ایک دوست نے بتایا کہ پنجاب یونیورسٹی کے کچھ لبرل طلبہ کے غنڈوں نے ان پر حملہ کر دیا اور انہیں طلبہ کے سامنے برہنہ پریڈ کرائی گئی۔ بھارت میں دُھوم مچانے کے بعد اسٹار پلس کے چھوٹے استاد پاکستان پہنچنے کے بعد غائب ہی ہو گئے ہیں۔ جب کے سارے گا ما پا نامی پروگرام سے شہرت حاصل کرنے والے امانت علی اور عائزہ رضا بھی نظر نہیں آ رہے۔ نامور رقاصہ شیما کرمانی اور صدیقی سے ہی پوچھ لیں۔ کہ پاکستان میں پرفارمنگ آرٹس کے شعبے میں ان کے لئے ماحول کتنا محدود اور تنگ ہے۔ کسی بھی ملک کو شہرت اس کی ذہین شخصیات اور فنکاروں سے نصیب ہوتی ہے کیونکہ یہ قوم کا سرمایہ ہوتے ہیں۔ ایسے فنکاروں کے بغیر کسی بھی معاشرے کی ثقافتی افزائش نہیں ہو پاتی کیونکہ یہی شخصیات تبدیلی کی علمبردار ہوتی ہیں۔ بدقسمتی سے ہماری ریاست کو تخلیق نہیں کیا گیا تھا اور نہ ہی وہ اس طرح کی شخصیات کے لئے موزوں ہے۔ ہمارا ملک صرف لٹیروں اور منافقین کے لئے ہی بنا ہے جو بلاخوف وخطر اپنی سرگرمیاں جاری رکھ سکیں۔ اسلامی جمہوریہ میں خوش رہنے کی واحد پالیسی یہی ہے کہ جمود کی مخالفت نہ کر و اس کا حصہ بن جاؤ اسے فروغ دو کیونکہ یہی کامیابی کی کنجی ہے۔

شرم تم کو مگر نہیں آتی

کوئی اُمید بر نہیں آتی — کوئی صُورت نظر نہیں آتی
مَوت کا ایک دِن مُعیّن ہے — نیند کیوں رات بھر نہیں آتی
آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی — اب کِسی بات پر نہیں آتی
جانتا ہُوں ثوابِ طاعت و زُہد — پر طبیعت اِدھر نہیں آتی
ہے کچھ ایسی ہی بات جو چُپ ہُوں — ورنہ کیا بات کر نہیں آتی
کیوں نہ چیخوں کہ یاد کرتے ہَیں — میری آواز گر نہیں آتی
داغِ دِل گر نظر نہیں آتا — بُو بھی اَے چارہ گر نہیں آتی؟
ہم وہاں ہَیں جہاں سے ہم کو بھی — کُچھ ہماری خبر نہیں آتی
مرتے ہَیں آرزُو میں مرنے کی — مَوت آتی ہے پر نہیں آتی

کعبے کِس مُنہ سے جاؤ گے غالبؔ
شرم تُم کو مگر نہیں آتی

پیغامبرِ سخن ـــــــ مظفر احمد مظفر

ڈاکٹر عبدالغفار عزم
پی ایچ ڈی مرحوم

ڈاکٹر عبدالغفار عزم ہندوستان میں کئی صدیوں پر محیط اُردو شاعری کی جامع تاریخ جو اپنی جمالیاتی قدروں اور رعنائی جہتوں کے ساتھ محوِ خرام ہے نہ صرف اس کے علمبردار ہیں بلکہ اس کی تمام تر توانائی اور میکانیت کا وجدان لیکر پیدا ہوئے ہیں۔ آپ نے جدیدیت کے حصار سے دامن بچا کر قدیم عصری رُجحان میں شعری پیکر تراشے ہیں ااور اس تجربہ میں غزل کی جمالیاتی رُوح کو بیدار کر دیا ہے۔ جس کے سبب زندگی کی لطافت اور حیات کا تلخ وشیریں احساس، کلام میں نکھر کر جلوہ افروز ہو گیا ہے۔ جس میں تہذیبی اقدار و اسلاف کے شعری محاسن کی بازگشت صاف سنی جا سکتی ہے۔ عزمؔ استعاروں اور علامتوں کو برتنے کا ہنر بخوبی جانتے ہیں۔ آپ روایتی اُسلوب کی جملہ پاسداری کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے نقطہ آفرینی کے جوہر دکھاتے ہیں۔

فکر خیال کی اُپج نے کلام میں وُسعت بیانی کے ساتھ ساتھ غم روزگار اور فکر جاناں کو باہم دگر مربوط کر دیا ہے گویا فنکار کمالِ ہنر مندی کا آئینہ لئے جملہ مسائل عشق و زندگی کی عکس بندی کا اہتمام کر رہا ہے۔ ان کے مابعد الطبعی تصورات میں زیادہ تر وہی نقطہ نظر ہے۔ جو اُردو کے ادبِ عالیہ میں مقبول اور مروّج رہا ہے۔ بایں ہمہ عزم کی غزل میں ان کا منفرد اندازِ فکر بھی ملتا ہے ۔ عام کلاسیکل روایت تدبیر پر تقدیر کی برتری کی رہی ہے۔ آپ بھی اس حقیقت کے قائل ہیں۔ شاعر کا جھکاؤ غزل کی کلاسیکل روایت کی طرف ہے۔ آپ موضوع اور ہیئت دونوں اعتبار سے روایت پرست واقع ہوئے ہیں۔ یعنی مجاز کی گرفت کلام پر نمایاں اثر انداز ہو رہی ہے آپ نے علم الکلام، منطق وفلسفہ کی اصلاحات کا استعمال یوں کیا ہے کہ گویا غزل کا مجموعی آہنگ دو آتشہ ہو گیا ہے۔ مثلاً تعینات، لاہوت، جز کل، تلقین، تکوین، جبر و اختیار کو فطری انداز میں کلام میں یوں برتا ہے کہ گویا قدرتی انداز میں آنے دیا ہے اور اس کو اپنی علمیت کے پرچار کا وسیلہ نہیں بننے دیا۔ جگر کے افسانہءِ حسن وعشق کی طرح آپ کے کلام میں بھی روایت کا احترام بدرجہ اتم موجود ہے۔ سنجیدہ اور مفکرانہ فکر خیال وتصور سے مل کر نغمہ میں تبدیل ہو کر داخلی جذبوں اور وارداتِ قلبی کو احساس جمال سے رُوشناس کر رہی ہے۔ لہجہ میں شخصیت کا سوز وگداز۔ الفاظ کی شیرینی اور روایت کی ایمائیت کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔

زباں و بیان کے صوتی پہلوؤں کا احساس اتنا شدید اور گہرا ہے کہ جس نے سہل نگاری اور لفظی بازی گری کا امکان ختم کر دیا ہے بااین ہمہ کلام غنائی اور صوتی آہنگ کا معراج بن گیا ہے۔ مخصوص رومانی ذہن غزل کے اشعار میں تجربہ کی آنچ اور فنکارانہ

چابک دستی سے مل کر لازوال ہوگیا ہے۔ باطنی اضطراب، قلبی کشمکش کو جنم دیتا ہے یہی اضطرابی کیفیت لذت غم کا شعور و ذائقہ فراہم کرتی ہے۔ آپ کے رومانی تجربوں میں نفاست اور شعری کاریگری میں معنی آفرینی اور ندرت بیانی درخورِ ستائش ہے لہجہ کی طہارت، تغزل کی رمزیت اور ایمائیت بلا شبہ لائق صد توصیف ہے۔ مافی الضمیر کے بیان میں آپ کا دلفریب اندازِ تحریر قابل رشک ہے۔ پس مشت نمونہ از خروارے پیش خدمت است۔

ہمیں تو حال دل کہتے ہوئے کچھ ڈر سا لگتا ہے
خیال اپنا نہیں ان کے گماں تک بات جائے گی
ہائے وہ لمحہ کہ دل کی خبر تو لے لوں
اتنی فرصت بھی سرِ دار کہاں سے لاؤں؟
غم حیات تمنا کا خون مجبوری
دیا بھی ہے تو مقدر نے کیا دیا مجھ کو
فروغِ شعلہ و شبنم کی زندگی کتنی
شبابِ حسن تو مثل حباب ہوتا ہے
بیاں بے بسی کا ستم کا فسانہ ہے
مرے درد دل میں ہے مضمر زمانہ
ہم لئے آتے ہیں ناموسِ وفا کا پرچم
خیر مقدم میں صلیبوں کو سجایا جائے
نقطہ اک مرکزِ معنی دیکھ
حرف ہو کر کتاب بولے ہے

غزل کی اشارتی زرخیزی سے شاعر نے کماحقہ فائدہ اُٹھاتے ہوئے کلام میں غنائیت و نغمگی سے ایک سحر انگیز کیفت پیدا کردی ہے جو دلربا اور پائیدار ہے۔ اشعار میں تصورِ حیات شفاف و سادہ ہونے کی وجہ سے رُومانیت جلوہ گر دکھائی دیتی ہے یہاں رُومانیت کا رشتہ ماضی سے قریب اور گہرا ہے اس لئے درون بینی سوز و گداز شعور و احساس اور وجدانی کیفیت نے حسّی تجربوں کو جذبہ و تاثیر سے جدا نہیں ہونے دیا۔

جواز خود قابل تحسین ہے۔ غنائیت غزل نگار کے ذہنی آہنگ سے مشروط ہوتی ہے۔ طبیعت کا زیر و بم میلانِ طبع، رمز بلیغ اور تناؤ شعر کے باطنی حسن و بقا اور کشش و پائیداری کی ضامن ہوتی ہے۔ آپ روایت پرست بھی ہیں اور روایت پسند بھی، اس اعتبار سے فطرت نے آپ کے ذہن رسا کو ماضی کے احساس اور اِرتقاء کے تدریجی رُجحان کے پہلو بہ پہلو کھڑا کردیا ہے۔ آپ کی شاعری ایک مخصوص رُومانی کردار کے پس منظر میں اُبھر کر کلاسیکل رنگِ تغزل کی عکاس ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ آپ کا زاویہ فکر جدید عصری تقاضوں اور مروجہ طرزِ اظہار سے نا آشنا ہے۔ عزمؔ نے جدید عصری انداز نظر کو بھی شعری بساط پر نغمہ و آہنگ کی ایمائی کیفیت کو وجدانی فکر سے سجایا ہے۔ جس کے سبب حسن و عشق کے ترانے رسمی طور پر ہی نہیں سنائی دیتے بلکہ جذبہ کی شدت اور ہم آہنگی سے ان میں نئی وُسعتیں اور جہتیں از خود پیدا ہوگئی ہیں۔ جن کے احساسِ جمال سے کلام کی فنی جامعیت و بلاغت اظہر من الشمس ہے۔ آپ کی شعری و استادانہ ہنرمندی کا لوہا نقادوں نے تسلیم کیا ہے۔

آپ کے یہاں رُموزِ فکر و فلسفہ بھی ہے اور دعوت کام و دہن بھی۔ آزادؔ و حالیؔ کے بعد ہمارے یہاں نظم کے ذریعہ سنجیدہ فکر کو اُجاگر کیا گیا ہے غزل کے اشارات ہمارے جذبات میں گرمی یا لطافت پیدا کر سکتے ہیں۔ غزل کا آرٹ ایک مخصوص تہذیب کا مرہون منت ہے۔ اور اسی میں پروان چڑھا ہے۔ اسی لئے غزل سے ہم نے ذہنوں اور موجودہ نسل کی ذہنی عکاسی کر سکتے ہیں۔ ادب زندگی کا آئینہ دار اور شاعری اس کا حاصل ہے۔ بہ الفاظ دیگر شاعری پیغمری ہے۔ عزمؔ کے ہاں مولانا اصغر حسین اصغرؔ گونڈوی کی لطافت اور ان سا انبساط ذہنی اور رُوحِ نشاط ملتی ہے۔ دوسری جانب فراق کی سی جدیدیت مگر قدیم لباس میں لپٹی ہوئی فکر بھی ملتی ہے۔ جس میں جدید ذہن کارفرما ہے۔ یعنی فراقؔ نے غزل کو جدید لب و لہجہ دیا لیکن عزم نے خوشگوار ہم آہنگی اور خوشبو سے لبریز احساسِ درد دیا جو فراق کے بس کی بات نہ تھی۔ فراقؔ کی زبان میں وہ سلاست بیانی اور برجستگی نہیں جو عزم کا طرہ امتیاز ہے جو انہیں میرؔ، مومنؔ داغؔ حسرتؔ وسیماب کے دبستان تک لے جاتا ہے۔ آپ کی شاعری کے مطالعہ سے زندگی کا نشہ تیز تر ہوجاتا ہے۔ ایک طرح کی سرمستی اور کیف اپنے حصار میں لے لیتا ہے بلکہ زندگی خود جھوم اُٹھتی ہے اور یہ کیفیت کبھی تبدیل ہوکر غم و اندوہ کے ریگ زاروں سے بھی آشنا کردیتی ہے جہاں زندگی بے دست و پا سراپا نالہ و فغاں معلوم ہوتی ہے۔ غرض آپ کے یہاں زندگی محض نشاطِ روح نہیں بلکہ از خود رُوحِ نشاط ہے۔ آپ کی حدیثِ دلبری میں زندگی اور مسائل زندگی کے سبھی نقوش اُبھر کر سامنے آتے ہیں۔ جو اُردو شاعری اور شعری روایت کو حیاتِ نو فراہم کر رہے ہیں۔ جو تا رانفاس غزل کو متحرک و نغمہ بار رکھنے میں اپنا کردار ادا کرتے رہیں گے۔ ان تمام جملہ اوصاف کے باوصف وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ موصوف فی الوقت نہ صرف ہماری شعری روایت کے امام ہیں بلکہ دنیائے غزل میں پیغمبر سخن بن کر وارد ہوئے ہیں۔ پس اُن کا خیر مقدم ہمارا ادبی فریضہ ہے۔

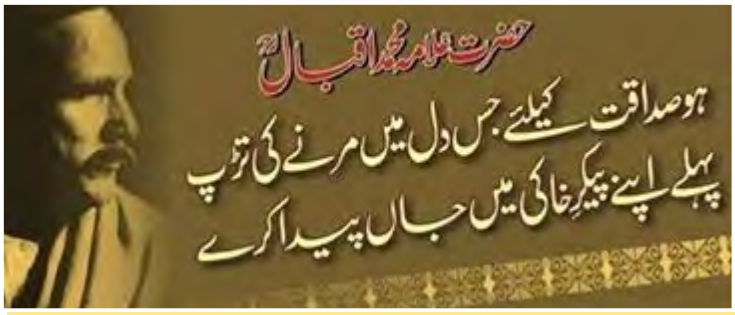

مشاعرہ قندیل شعروسخن باہم

(رپورٹ رانا عبدالرزاق خاں)

آج مورخہ ۱۰ جولائی ۲۰۱۶ بروز اتوار ۹۹ نائٹنگیل لین بالم میں مشاعرہ منعقد ہوا۔ یہ مشاعرہ قندیل شعروسخن مشاعرہ وانڈورتھ کے فورم کے زیر انتظام تھا۔لندن میں سے دُور دُور سے بہت سارے شعراء تشریف لائے تھے،محفل کے میزبان رانا عبدالرزاق خان نے بہت ہی خوش اسلوبی سے نظامت کے فرائض ادا کئے ۔ پہلے حصہ جناب طفیل عامر کی کتاب ''دستک سے تھکے ہاتھ'' کی تقریب رونمائی پر مشتمل تھا۔اس کتاب پر جناب امجد مرزا امجد نے تجزیہ پیش کیا۔جو بہت ہی مفصل اور دلکش تھا۔ان کے بعد جناب اقبال مجیدی صاحب نے اس کتاب کے بارے میں اپنی رائے پیش کی۔اور مقالہ پڑھا اور طفیل عامر کی کاوش کو بہت سراہا۔اور اس کتاب کا مکمل تجزیہ کیا۔ان کے بعد رانا عبدالرزاق خان نے بھی اس کتاب پر تبصرہ کیا۔کتاب ۷۹ غزلوں پر مشتمل ہے۔زیادہ تر غزلیں چھوٹی بحر میں ہیں۔کلام بہت ہی شستہ ہے اس کے بعد مشاعرہ شروع ہوا۔جس کی صدارت،محترمہ حمیدہ معین رضوی کے حصے میں آئی،اور مہمانانِ خصوصی کا اعزاز،عذرا ناز صاحبہ ریڈنگ،نیلم جوگن صاحبہ،ڈاکٹر صوفیہ سطوت صاحبہ،کو دیا گیا۔باقی شرکاء مشاعرہ مندرجہ ذیل تھے۔مبارک صدیقی،عاصی صحرائی،اقبال مجیدی کرسٹل پیلس ،امجد مرزا امجد بارکنگ،سوہن راہی،،ریاست رضوی،ثروت اقبال،،محمود علی محمود،ساجد محمود رانا،رمضان شائق،واحد اللہ جاوید، ثروت اقبال،عبدالقدیر کوکب،منظور ریحان نے مشاعرے میں کلام سنا کر بہت داد حاصل کی۔جناب امجد مرزا امجد نے نعتیہ کلام اور غزل سنا کر سماں باندھ دیا۔اقبال مجیدی نے دہلوی سٹائل میں کلام سنا کر سامعین کو خوب خوش کیا،سوہن راہی نے پنجابی کلام کے علاوہ اپنے گیت بھی سنائے۔جن کو سامعین نے بہت سراہا،نیلم جوگن نے بھی نعتیہ کلام سنا کر سب کو حیران کر دیا،۔اپنے خاص انداز میں کلام سنا کر محفل میں رنگ جما دیا۔،اقبال مجیدی ،امجد مرزا امجد،سوہن راہی ،عذرا ناز صاحبہ ریڈنگ،نیلم جوگن صاحبہ،ڈاکٹر صوفیہ سطوت صاحبہ اور ساجد محمود رانا نے کلام سنا کر حاضرین کے دل موہ لئے۔سب شعراء کا کلام سُن کر ہر طرف سے واہ واہ کی آوازیں آرہی تھیں۔حاضرین نے دل کھول کر داد دی۔دورانِ مجلس جوس کیک بسکٹ کا خاطر خواہ انتظام تھا،آخر میں کھانا اور آئس کریم پیش کیا گئی۔محفل خوب بارونق تھی،سبھی نے ایسی مجالس کے انعقاد پر خوشی کا اظہار کیا۔سب احباب خوشی خوشی دوبارہ ملنے کے وعدے کے ساتھ،اور اس سہانی شام کی یادوں کو لئے ایک دوسرے سے جدا ہوئے۔

خطوط

۱۔شاہنواز بھٹو کا خط مسٹر بوچ کے نام

آزادی کے بعد جونا گڑھ کے نواب نے پاکستان کے ساتھ الحاق کا فیصلہ کیا تب ذوالفقار علی بھٹو کے والد شاہنواز بھٹو نے انڈین حکومت کے نام خط لکھا جس میں انڈیا کو جونا گڑھ پر قبضے کی دعوت دی۔ چونکہ شاہنواز بھٹو اس وقت دیوان کے عہدہ پر تھے۔ انڈین حکومت نے اس خط کو جواز بنا کر جونا گڑھ پر حملہ کر دیا اور اس پر قابض ہو گئے۔ یوں ایک پوری ریاست پاکستان کے ہاتھ سے نکل گئی۔

۲۔ذوالفقار علی بھٹو کا خط اسکندر مرزا کے نام

۱۹۵۸ء میں ذوالفقار علی بھٹو نے اسکندر مرزا کے نام خط لکھا جس میں اس کی بے شمار تعریفیں کرتے ہوئے لکھا کہ ''تاریخ تمہیں قائداعظم سے بھی بڑے لیڈر کے طور پر یاد کرے گی'' اس خط کے بعد اسکندر مرزا نے ذوالفقار علی بھٹو کو کامرس کا وزیر بنا دیا۔ جس کے بعد بھٹو نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ بعد میں ذوالفقار علی بھٹو نے جو کچھ پاکستان کے ساتھ کیا وہ تاریخ کا حصہ ہے۔

۳۔مجیب الرحمن کا خط نہرو کے نام

بھارتی مصنف ششانکہ بینرجی نے اپنی کتاب ''انڈیا، مجیب الرحمن، بنگلہ دیش لبریشن اینڈ پاکستان'' میں انکشاف کیا ہے کہ نہرو کی ملاقات مجیب الرحمن سے ۱۹۶۲ء میں ہوئی جس میں مجیب الرحمن نے اُسے ایک خط دیا۔ جس میں نہرو سے بنگلہ دیش کی آزادی کے لئے مدد مانگی گئی تھی۔ پھر انڈیا نے بنگلہ دیش میں سازشوں کے جو جال بچھائے ہم ان سے واقف ہیں۔

۴۔عاصمہ جہانگیر کا خط نیویارک ٹائمز کو

۱۹۸۳ء میں عاصمہ جہانگیر نے ''نیویارک ٹائمز'' کو خط لکھا جس میں اس نے بتایا کہ پاکستان میں عورتوں پر بدترین ظلم ہو رہا ہے۔ اور اس کے خلاف کوئی ان کا مددگار نہیں۔ نیویارک ٹائمز'' اس ظلم سے ساری دنیا کو آگاہ کرے۔ ان خطوط کے بعد عاصمہ جہانگیر کو پاکستان میں بتدریج طاقت دی گئی۔ عاصمہ جہانگیر کی سرپرستی میں وہ طبقہ پروان چڑھا جنہیں ہم دیسی لبرلز کہتے ہیں۔

۵۔بے نظیر بھٹو کا خط راجیو گاندھی کے نام ۱۹۸۹۔۱۹۹۰

میں بے نظیر بھٹو نے راجیو گاندھی کے نام خط لکھا۔ جس میں خالصتان کی تحریک چلانے والے تمام سکھوں کے متعلق معلومات تھیں۔ اس خط کے ملنے کے بعد انڈیا نے خالصتان کی تحریک چلانے والے تمام سکھوں کو ان کی خفیہ پناہ گاہوں سی گرفتار یا قتل کر دیا۔ بے نظیر بھٹو بعد میں بڑے فخر سے کہا کرتی تھیں کہ ''میری مدد کے بغیر راجیو گاندھی کبھی خالصتان کی تحریک پر قابو نہ پا سکتا تھا''۔ دادا کی وجہ سے جونا گڑھ گیا بیٹے کی وجہ سے بنگلہ دیش بنا، اور پوتی کی وجہ سے خالصتان ہاتھوں سے گیا۔ یاد رہے اگر خالصتان بن جاتا تو باقی انڈیا بھی ٹوٹ جانا تھا۔

۶۔بے نظیر بھٹو کا خط امریکی سفیر کے نام

۱۹۹۰ء میں بے نظیر بھٹو نے انڈیا میں امریکی سفیر کے نام خط لکھا۔ جس میں اس نے امریکہ کو اپیل کی کہ پاکستان کو معاشی اور دفاعی امداد بند کی جائے۔ اور ورلڈ بنک اور آئی ایم ایف پاکستان کو قرضہ دینا بند کر دے بلکہ ہر قسم کی تجارت بند کرے۔ ایف ۱۶۔ طیاروں کی، اور پرزوں کی فراہمی روک دی جائے۔ اور امریکہ انڈین وزیراعظم پر دباؤ ڈالکر حملہ کرائے۔ یہ ہے محترمہ کا کردار۔

۷۔آصف علی زرداری کا خط امریکی ایڈمرل مائکل مولن کے نام

آصف علی زرداری نے ۲۰۱۱ء میں امریکی ایڈمرل مائکل مولن کے نام ایک خط لکھا کہ جو'' میموگیٹ سکینڈل'' کے نام سے مشہور ہے۔ جس میں آصف علی زرداری صدر پاکستان نے پاک فوج اور آئی ایس آئی کے خلاف مدد طلب کی۔ جس کے بدلے میں مندرجہ ذیل پیشکش کی گئیں۔ امریکی سفارشات کی روشنی میں اُسامہ بن لادن کو پناہ دینے یا اس سے تعلقات رکھنے والے تمام مشتبہ افراد اور جرنیلوں کے خلاف کاروائی۔ ۲۔ امریکہ کی پسندیدہ شخصیات پر مشتمل ایک نئے سول دفاعی ادارے کا قیام، جو آئی ایس آئی کو کنٹرول کرے۔ ۳۔ امریکی فورسز کو پاکستان کے کسی بھی علاقے میں اپریشن کرنے کی اجازت۔ ۴۔ ایمن الظواہری، ملاعمر، سراجدین حقانی کو فوری طور پر امریکہ کے حوالے کرنے کی یقین دہانی۔ ۵۔ بمبئی حملوں میں شامل سب پاکستانیوں کے خلاف کاروائی، اور انڈیا حوالگی کی یقین دہانی۔ اس مراسلے کا انکشاف ایک امریکی پاکستانی نژاد منصور اعجاز نے کیا کہ یہ سب کچھ فوج اور آئی ایس آئی کو لگام ڈالنے کے لئے کیا گیا ۔۶۔ امریکہ حکومت کو ایٹمی پروگرام تک رسائی۔ ایبٹ آباد آپریشن آصف زرداری کے ایماء پر کیا گیا۔

۸۔ایم کیو ایم کا خط انڈیا حکومت کے نام

۱۸ جون ۲۰۱۵ کو ایم کیو ایم نے انڈیا حکومت کے نام ایک خط میں لکھا ہے۔ کہ پاک فوج کے اپریشن کی وجہ سے ہم پر بہت ظلم ہو رہا ہے۔ بہت سے ہمارے کارکن غائب اور مارے جا رہے ہیں۔ ہم آپ سے اپیل کرتے ہیں کہ آپ اس صورت حال کو بہتر بنانے میں ہماری مدد کریں۔ کیا انڈیا انڈیا جیسا خبیث دشمن ''نیشنل ایکشن پلان'' کے خلاف ایم کیو ایم کے حق میں کیسے بہتر بنا سکتا ہے۔؟

۹۔پاکستانی میڈیا پر یہ خبر گردش کرتی رہی ہے کہ وزیراعظم پاکستان کے بیٹے حسین

نواز نے ۱۹۹۹ء کی طرح اب پھر پانامہ لیکس کے بعد پاک فوج کے خلاف انڈیا سے مدد طلب کی ہے کہا جاتا ہے اس خط کے بعد انڈیا نواز شریف کو بچانے کے لئے کھل کر سامنے آیا ہے۔ انڈیا میڈیا میں بعض اہم لوگوں کے بیان نواز شریف کے حق میں آئے ہیں۔ (ماخوذ)